مہمان بہار

اشفاق احمد

مکتبہ میری لائبریری لاہور

صدر دفتر:
چوک اردو بازار لاہور ۲

شوروم
چوک مینار انارکلی لاہور ۳

جملہ حقوق محفوظ

ناشر:- بشیر احمد چودھری
ڈائریکٹر میری لائبریری لاہور

طابع:- استقلال پریس لاہور

محی الدین اثر کے نام ———— !

کمرے کی بتی بجھا کر اختر پلنگ پر لیٹ گیا۔ نئے تکیے کو گھُنہرا کر کے اس نے سر کے نیچے رکھا اور تپائی پر ایش ٹرے میں پڑی ہوئی سگریٹ کو غور سے دیکھنے لگا جیسے راکھ کی موٹی سی تہ نے قریباً قریباً گل کر دیا تھا۔ رات کا پہلا پہر تھا۔ اسے بیدل کی غزل یاد آ گئی۔

ستم است اگر ہوست کشد کہ بسیر سرو سمن در آ
تو ز غنچہ کم نہ دمیدۂ در دل کشا بہ چمن در آ

ایک عرصہ گزرا اس نے لکھنؤ اسٹیشن سے راگ سورٹھ میں یہ غزل سنی تھی۔ تیسر فراتی نال نے اس کے ذہن میں ہیجان پیدا کر دیا اور وہ تکیے کو گود میں ڈال کر پلنگ پر بیٹھ گیا۔ آواز نہ تو باہر سے آ رہی تھی اور نہ اس کے کمرے کے ریڈیو تھا۔ اس پر بھی وہ ایک ایک لفظ صاف سن رہا تھا اور اس کی روح نکلی جا رہی تھی۔ جب مقطعہ پڑھا جا چکا تو وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ سائیڈ بورڈ پر پڑے ہوئے اٹیچی کیس سے اس نے موم بتی نکالی اور جلا کر موم کے دو چار قطرے

کرسی کے بازو پر گرائے۔ موم بتی کو اس جگہ کھڑی کر کے وہ واپس اپنے بستر پر آ کر لیٹ گیا۔ اچھا بھلا سونے والا تھا۔ لیکن اس غزل نے اس کی نیند "چھو" کر کے غائب کر دی۔ سگریٹ پینے کو اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ کتاب پڑھنے کا موڈ نہیں تھا۔ اور گانا وہ سن ہی چکا تھا۔ اس نے آہستہ سے اٹھ کر بغلی غسلخانے کا دروازہ کھولا موم بتی کی دھیمی سی روشنی میں پانی سے بھری بالٹی کو دیکھا پھر بریکٹ سے چینی کا مگ اٹھا کر بالٹی میں چھوڑ دیا۔ مگ بالٹی کے پیندے سے ٹکرایا تو چھنم چھنم کی ہلکی سی آواز پیدا ہوئی اور بل کھاتا ننھا منا سا بھنور غائب ہو گیا۔ آستین چڑھا کر اس نے مگ باہر نکالا۔ اس کی بانہہ کے سنہرے بال سفید جلد کے سینے سے چمٹ گئے۔ اور مگ کے پیندے اور اس کی مٹھی کے نیچے کی چھوٹی سی چونچ سے پانی کے قطرے ٹپکنے لگے۔ مگ کو میز پر رکھ کر اس نے ایک نظر موم بتی کو دیکھا جس کے ارد گرد بہت سی پگھلی موم لپٹ گئی تھی۔ اختر نے تولیہ اٹھا کر اپنے بازو کو پونچھا اور موم بتی کرسی سے اٹھا کر میز پر جما دی۔ پھر اس نے اپنا شیو کا سامان نکالا اور حجامت بنانے لگا۔ نئے بلیڈ کی تیز دھار نے جلد کے نیچے حرارت پیدا کر دی اور اس نے اپنے ہاتھوں پر سانس کے لمس کو پہلے قدرے گرم محسوس کیا۔ جھاگ چہرے سے بالکل چھٹ چکی تھی لیکن وہ سیفٹی چلائے جاتا تھا۔ کھونٹی بلور سی نکل آئی تھی پر اس کا ہاتھ تھمتا نہیں تھا۔ اتنے میں ہوائیں میوزک کی دھن بجانے لگیں۔ گنگ کہیں قریب ہی جھنجھنا رہی تھی اور باقی ساز بہت دور سے ساتھ دے رہے تھے۔ بڑی دیر تک سیفٹی چلتی رہی۔ گنگ بجتی رہی اور سانس بھانپ دیتی رہی کہ بی

سی سے ٹوٹنک! ٹوٹنک!! ٹوٹنک کا سگنل ہوا۔ بگ بین نے آدھا بجایا اور صوتی طلسم ٹوٹ گیا۔ اسی تولیئے سے منہ پونچھ کر اختر پھر اپنے پلنگ پر لیٹ گیا۔ موم بتی بڑی تیزی سے گھلنے لگی تھی۔ پھیلن سے لتھڑے ہوئے برش کی جھاگ کم ہوتی جا رہی تھی اور مگ میں پڑے ہوئے دودھیا پانی کی سطح نیلگوں سی ہو رہی تھی جس پر سفید راکھ کی پھٹکیاں سی تیرنے لگی تھیں۔ موم بتی کے ختم ہونے سے پیشتر اختر نے سونے کی کوشش کی اور وہ اس کے سنبھالا لینے سے ایک آدھ منٹ پہلے زور لگا کر سو ہی گیا۔

آج سے چند ماہ پیشتر اختر لاہور کا ایک تاجر تھا۔ اس کی اپنی دوکان تھی اور اس دکان کے پچھواڑے اس کا اپنا ایک کمرہ تھا جس میں ایک پرانے سے پلنگ اور میز کرسی کے علاوہ ایک سٹوو لیمپ بھی تھا۔ دوپہر کو وہ بڑی باقاعدگی سے دوکان دو گھنٹے کے لئے بند کرتا۔ نوکر کو چھٹی دے دیتا اور خود اس کمرے میں آکر چائے تیار کرنے لگتا۔ ایک کپ چائے تیار کرنے کے لئے وہ کیتلی میں ہمیشہ تین کپ پانی ڈال کر سٹوو لیمپ پر چڑھایا کرتا۔ پانی کھولنے لگتا لیکن وہ بڑے مزے سے اپنے جھلنگا پلنگ پر لیٹا امریکن رسالے پڑھتا رہتا۔ اسے پانی کی سوں سوں ساں ساں سننے میں بڑا مزہ ملتا تھا اور وہ ایک ماہر جلترنگ بجانے والے کی طرح بھانپ جاتا تھا کہ اب کیتلی میں کس قدر پانی رہ گیا ہے۔ ایک پیالی پانی رہ جانے پر اس کا رسالہ خود بخود بند ہو جاتا اور

وہ ایک دم اٹھ کر چائے بنانے میں مصروف ہو جاتا۔ اور جب تک چائے بیسیج رنگ چھوڑتی وہ انگلی سے ڈبے کا دودھ نکال کر چاٹتا رہتا۔ ایک دوپہر اختر اس کرسچن چھوکری کو جو اس کی دوکان پر سینڈل خریدنے آئی تھی اپنے کمرے میں یہی جلترنگ سنانے کی غرض سے لے آیا۔ اس مرتبہ چونکہ اس کے ہاتھوں میں امریکن رسالوں کی بجائے کرسچین لڑکی تھی۔ اس لئے کھولتا ہوا پانی ایک پیالی سے کم ہو کر ایک چمچی رہ گیا اور جب وہ چمچی بھر پانی بھی سڑ گیا تو کیتلی کا پیندا جل گیا اور اس کے ٹانکے کھل گئے۔ اور جب اختر اس لڑکی کے ساتھ واپس اپنی دکان پر آیا تو اس نے سات روپے تیرہ آنے کا سینڈل سات روپے تیرہ آنے میں دے دیا اور جلترنگ سنانے کا ایک پیسہ بھی نہ لیا!

اختر اس کے نوکر اور مالک مکان کے علاوہ کسی کو بھی اس کمرہ کا علم نہ تھا جو ایک سیلی سی ڈھلوان گلی کے آخری سرے پر واقع تھا اور جس کی ایک دیوار اختر کی دوکان کی پشت تھی۔ اس گلی میں ایسے بہت سے کمرے اور کوٹھڑیاں تھیں جہاں براہ راست درآمد کرنے والے تاجروں کے سامان جملہ فروشی کے انبار لگے ہوئے تھے۔ اس گلی میں رہائش کرنے والا میم صاحب کا ایک بڈھا جوڑا رہتا تھا جس کا اکلوتا بیٹا ہندوستان کی بحری فوج میں ملازم تھا جو ان کے طویل خطوں کا جواب مختصر سے تاروں میں دیا کرتا اور کبھی کبھار پاپا کو سگریٹوں کا ایک ڈبہ پارسل کر دیا کرتا تھا۔ جسے بڈھا ہمیشہ اختر کی دوکان میں آکر کھولا کرتا۔

لاہور کی اس کوٹھیوں ماری سڑک پر اختر کی دوکان کے سوائے گرد

نزدیک کوئی بڑی دوکان نہ تھی اور چونکہ ایسے مقام پر بکری کا کوئی امکان نہیں ہوتا اس لیئے اختر کے اباجی اسے ہمیشہ فہمائش کرتے رہتے کہ اگر بزنس کرنی ہے تو شہر کے کسی بازار میں جگہ لے کر کہ جہاں چار گاہک آئیں بھی۔ لیکن بازار کی دوکانوں میں یہ نقص ہوتا ہے کہ اول تو ان کے پیچھے کوئی کمرہ نہیں ملتا اور اگر ملے بھی وہ کسی ڈھنڈار گلی میں واقع نہیں ہوتا۔ اختر زیادہ گاہکوں کی ریل پیل کے حق میں نہیں تھا۔ وہ تو دن بھر میں ایک گاہک کی آمد کا خواہاں تھا جسے وہ کینوس کا ایک بوتا دے کر اس کی کھال اتار لے۔

اختر کے اباجی خاندانی سوداگر تھے۔ اکبری منڈی میں ان کی بہت بڑی دوکان تھی اور وہ نسل ہا نسل سے تجارت کرتے کرتے اس پیشے سے تنگ آگئے تھے اور جس طرح ہر شخص اپنے پیشے سے نفرت کیا کرتا ہے اور اپنے بیٹے کو ہر گز ہر گز اس کی سفارش نہیں کرتا۔ اختر کے اباجی بھی بزنس کے بہت خلاف تھے۔ ان کی دلی تمنا تھی کہ اختر کوئی اچھی سی نوکری کر کے اپنے چچا سے بازی لے جائے۔ جو بمبئی کسٹمز کے محکمے میں ایک بڑے آفیسر تھے۔ اختر کی متعلمانہ زندگی بڑی امید افزا تھی اس نے میٹرک کے امتحان میں ایک مرتبہ فیل ہو کر اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا اور کالج کے زمانے میں اپنی علمیت کے ایسے ایسے مظاہرے کیئے تھے کہ اباجی کی آس بندھ گئی تھی۔ بی۔ اے میں نفسیات اور سیاسیات کا طالب علم ہونے کے باوجود اس نے فرسٹ کلاس حاصل کی اور آرٹس کے طلبا میں کالج بھر میں اول رہا۔ لیکن بی۔ اے کر لینے کے بعد اس نے نوکری کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور اباجی سے چار ہزار

روپے لے کر بوٹوں کی یہ دوکان کھول لی۔

دوپہر کو جلترنگ سننے کی طرح اس کا ایک مشغلہ اور بھی تھا۔ وہ ہر روز باقاعدگی سے لائبریری جاتا۔ اخبار پڑھتا اور رسالے دیکھتا۔ اور اپنی فائل نکال کر دوستوں کو چٹھیاں لکھا کرتا۔ اختر کے خیال میں خطوط نویسی کے لیئے لائبریری سے بڑھ کر کوئی اور جگہ نہ تھی۔ ایک صفحہ لکھ کر وہ کاغذ فائل میں رکھتا۔ کور کو بڑے اہتمام سے باندھتا اور باہر برآمدے میں آ کر سگریٹ پینے لگتا۔ چپراسی کے پاس سیڑھیوں پر بیٹھ کر سگریٹ پینے میں اسے بڑا لطف آتا۔ کیوں کہ لائبریری میں داخل ہونے والے ہر شخص کی نگاہیں اس سفید پوش آدمی پر پڑتیں اور چند لمحوں کے لیئے اس کے وجود پر گڑ کر رہ جاتیں۔ اور اختر کی یہ سب سے بڑی خواہش تھی کہ کوئی اسے دیکھے اس پر توجہ دے اور اس کا تماشہ کرے۔ اس خواہش کے پیش نظر اسے اکثر بہت عجیب و غریب حرکات کرنا پڑتیں۔ ہوٹل میں کھانا کھاتے ہوئے وہ ہمیشہ اپنا دایاں پاؤں کرسی پر رکھ کر بیٹھا کرتا اور اگر اس کے ساتھ فیشن ایبل قسم کی خواتین ہوتیں تو وہ کوئی چیز کھانے سے پہلے بیرے کو "بھائی بیرے صاحب" کہہ کر پکارتا اور اس سے پوچھتا "یار اس چیز کو انگریزی میں کیا کہتے ہیں؟" بیرا ہنستا اور اس کو کچھ بتائے بغیر اسی طرح مسکراتا دوسرے بیروں کے پاس جا کر کھڑا ہو جاتا۔ کٹلس یا شامی کباب انگلیوں میں پکڑ کر کھاتے ہوئے وہ اپنی ساتھی لڑکی سے پوچھتا۔

"یہ کانٹا تمہارے حلق میں نہیں چبھتا، مجھے تو اس سے بہت ڈر لگتا ہے اور پھر میں اس کی مدد سے کوئی چیز بھی نہیں اٹھا سکتا۔ ایک دفعہ

استعمال کر بیٹھا تھا۔ سالن کی پلیٹ میں چھوٹے سے گول آلو پر کانٹا مارا تو وہ گولف کی گیند ایسا ابھرا اور سامنے بیٹھے ہوئے ایک شریف آدمی کے سر پر لگا۔ پچ مجھے تو اس سے بہت ڈر لگتا ہے۔"

لڑکیاں اختر کی ایسی باتوں پر ناخوش نہ ہوتیں بلکہ خوب ہنستیں!

رات وہ ہوائین گٹار سنتا ہوا سویا تھا۔ نیند میں اس نے ساحل کے آس پاس کارک کی کشتی میں بیٹھ کر سیر کی۔ غزالی آنکھوں والی ہسپانوی لڑکیاں سمندر کے کنارے زور زور سے قہقہے لگا کر اسے شرارتیں کرتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔ پتوار سے ٹانگیں لٹکا کر اس نے سمندر کے نیلے پانی پر چپّو کی طرح پاؤں مارنے شروع کر دیئے۔ بڑی دور جہاں سمندر اور آسمان ملتے ہیں خوب صورت زاویئے بنا کر اڑنے والے ایلبٹروس پیر رہے تھے، اختر کشتی کے بیچوں بیچ کھڑے ہو کر انہیں اپنی زبان میں زور زور سے پکارنے لگا۔ "بھائی ایلبٹروسو ادھر آؤ۔ اپنی کہو ہماری سنو۔" پھر اس نے کان پر ہاتھ رکھ کر الاپنا شروع کر دیا۔

چاروں اور ہے پانی پانی۔
ایک بھی قطرہ پی نہ سکوں۔
تم ہی بتاؤ ایلبٹراسو
مر جاؤں یا زندہ رہوں!

رعنا غزال لڑکیاں اور زور زور سے ہنسنے لگیں۔ اور وہ اسی طرح گیت

گاتا واپس ساحل پر ان کے پاس آگیا۔ ازو لیبلا نے کہا "آج اگر سبق لینے نہیں چلو گے سو یلا کا میلہ سر پر آرہا ہے۔"

اختر نے اپنے نچلے ہونٹ پر انگلی چلا کر کتارہ بجاتے ہوئے کہا "ضرور بضرور!" اور ساری پارٹی ہنستی کھیلتی چلنے لگی۔

استاد روجر چبوترے کے ایک کنارے پر کھڑا نوجوانوں کو مشق کرتے دیکھ رہا تھا۔ اختر نے اپنا چمکیلا سرخ پارچہ اٹھا لیا اور استاد کو جھک کر سلام کیا۔ تنگ پتلون اور صدبت سے ٹخنوں والی بنڈی پہنے ملازم کمان ایسے سینگ لے کر آگے بڑھا اور حلق سے اپنے بھینسے کی سی آواز نکال کر اختر کو چیلنج دینے لگا۔ اختر اپنے پارچے کو کمبے سے جھٹک کر پہلو بدل لیتا اور ملازم خود ٹھوکر کھا کر آگے نکل جاتا۔ اور روجر دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ اسے خوشی ہو رہی تھی کہ اختر نے اپنے ساتھیوں کے مقابلے میں جلد ترقی کر لی ہے۔ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے استاد اختر کے پاس آیا اور اس کے ہاتھ سے پارچہ لے کر کہنے لگا "کبھی کبھی پارچہ تمہارے جسم سے لگ جاتا ہے۔ جلدی میں تم اپنی کہنیوں کا زاویہ غلط کر جاتے ہو، یہ ٹھیک نہیں دیکھو" ملازم اسی طرح نتھنوں سے آواز نکالتا استاد کی طرف بڑھا اور استاد نے پینترا خالی دیا۔ پارچہ اختر کو لوٹاتے ہوئے روجر نے کہا "یہ کبھی نہ بھولو کہ بل لوٹ کر پھر حملہ کرنے آرہا ہے۔ اپنا فن دکھانے کے لئے لاپرواہی کے مظاہرے جسمانی حرکتوں سے کرو۔ لیکن اپنی توجہ ہمیشہ بل پر مرکوز رکھو — چلو شاباش چلو"
اور مشق شروع ہو گئی۔

سعیدہ نے لحاف کا کونہ ذرا سا اٹھایا اور اختر کی ناک چٹکی میں پکڑ کر ہولے ہولے ہلاتے ہوئے کہا:"

"منو۔ تو جی اتو جی دن نکل آیا۔" اختر نے نیم وا آنکھوں سے اسے دیکھا اور چھیڑنے کی غرض سے اپنی ناک سکوڑ کر کہا۔

"ستیاناس کر دیا۔ سارا کھیل بگاڑ دیا۔"

"کیوں" سعیدہ نے پوچھا۔

اختر نے کہا "میں بل فائٹنگ کر رہا تھا اور تم نے آ کر میری توجہ ہٹا دی۔ اگر سینگ میرے پہلو میں گھس جاتا تو؟" سعیدہ نے حیرانی سے کہا: "بل فائٹنگ؟"

"ہاں۔ ہاں بل فائٹنگ" اختر نے جھوٹ موٹ تنک کر کہا۔

"یہاں بستر میں؟" سعیدہ نے پوچھا۔

"پھر اور ہو" اختر نے سنجیدگی سے کہا "بستر میں لیٹ کر تو میں اپنی حرکات سے لاپرواہی کا اظہار کر رہا تھا ورنہ میری ساری توجہ تو بل پر ہی مرکوز تھی"

اس کی بات سعیدہ کی سمجھ میں نہ آئی۔ اس نے جھنجلا کر کہا "پتہ نہیں کیا فارسی بول رہے ہیں آپ ——— اٹھیے امی بلا رہی ہیں۔ چائے ٹھنڈی ہو جائے گی" اختر نے اس کی باتوں کا جواب دیے بغیر سعیدہ کو کندھوں سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور اس کا منہ چوم لیا۔ سعیدہ گھبرا کر چارپائی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

اختر نے پوچھا: "تم ابھی ابھی آلو بخارا کھا کر آئی ہو؟"

سعیدہ نے کوئی جواب نہ دیا تو اختر نے آپ ہی آپ کہا۔ "اوں بھلا آج کل آلو بخارا کہاں ہوتا ہے۔ اچھا تو چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے؟"

"ہاں" سعیدہ نے جھینپ کر کہا۔

اختر نے اٹھ کر کہا "تم چلو میں منہ پر ایک چھپاکا مار کر ابھی آتا ہوں۔"

غسلخانے میں جا کر اختر نے رات کے باسی پانی سے چہرے پر پے در پے کئی تڑ تڑے دیے اور تولیے سے دونوں گال رگڑتا بڑے کمرے میں چلا آیا۔

چچی نے کہا "صدقے جاؤں چائے کب سے بنا کر رکھی ہے اور تم خیر سے اب اٹھے ہو۔"

اختر نے جھوٹ موٹ جمائی لے کر کہا: "خفا کہاں ہوں چچی اٹھا دیا گیا ہوں۔ میں نے تو جب سے دکان چھوڑی ہے ساڑھے گیارہ بجے سے پہلے نہیں اٹھتا۔"

اس پر سعیدہ ہنسنے لگی۔

اختر نے منہ پکا کر کے کہا: "خدا کی قسم چار مہینے سے سورج نکلتا نہیں دیکھا۔ پتہ نہیں اب کیسے نکلتا ہے۔ پہلے تو بے چارہ زرد سا چہرہ لے کر طلوع ہوا کرتا تھا۔ اور پھر اس نے سعیدہ کی طرف دیکھ کر کہا: "ایمان سے مجھے تو اس کی فکر کھائے جاتی ہے۔"

"کس کی؟" چچی نے چونک کر کہا۔

"سورج کی۔" اختر نے شاہی ٹکڑے میں انگلی گڑو کر کہا۔

اس پر چچی بھی ہنسنے لگیں۔

اختر نے پوچھا: "چچی شاہی ٹکڑے کیسے بنتے ہیں؟"

چچی نے پیپر کی چکتی کاٹتے ہوئے کہا "کیوں تو کیوں پوچھ رہا ہے۔
اب ہوٹل کھولنے کا ارادہ ہے کیا؟"

اختر نے مسکرا کر کہا "ہوٹل تو خیر اب میں کیا کھولوں گا۔ لیکن اگر
ولایت میں میرا دل شاہی ٹکڑے کھانے کو چاہا تو یہ نعمت کہاں سے لوں گا؟"

"مجھے لکھ دینا۔ میں بھیج دوں گی۔" چچی نے بڑی سنجیدگی سے کہا "پارسل
کردوں گی۔"

"تو میرا پتہ لکھ لو" اختر نے سعیدہ کو مخاطب کر کے کہا "انگلستان کے
وزیر اعظم کی معرفت، ۱۰ ڈاؤننگ سٹریٹ لندن، بھجوا دینا۔"

چچی نے یقین مان کر کہا "یاد رکھنا بچی چائے پی کر اسی کاغذ پر لکھ لینا
میرے ہاتھ کے بنے ہوئے شاہی ٹکڑے اگر انگریز کھائیں گے تو اس موٹی
پیسٹری کو منہ تک نہ لگائیں گے۔"

سعیدہ نے اثبات میں ہلکا سا سر ہلایا اور چائے پیتی رہی۔ چچی اٹھ
کر باورچی خانے میں چلی گئیں تو سعیدہ نے آہستہ سے پوچھا۔

"آج آپ باہر جائیں گے کہ گھر پر ہی رہیں گے؟"

اختر نے کہا "کیوں تمہاری کیا رائے ہے؟"

سعیدہ نے جواب دیا "گھر پر ہی رہیے۔ میں پہلے دو پیریڈ پڑھ کر آ
جاؤں گی۔ پھر ہم جگ سا پزل جوڑیں گے۔ میں نے آپ کے لئے بارسے ولا
دکان سے خریدا تھا۔"

"اور اسے آج تک جوڑا نہیں؟"

"جوڑنے کی کوشش تو کی پر وہ مجھ سے جوڑا نہ جا سکا۔"

"تو مجھ کو تم نے جڑیا سمجھ لیا ہے۔"

"اور کیا۔"

"بھلا جڑائی کیا ملے گی۔"

سعیدہ خاموش رہی۔

اختر نے سیدھی انگلی کھڑی کر کے کہا "بس ایک، صرف ایک۔"

سعیدہ نے اس کا بھی کوئی جواب نہ دیا اور اپنی نگاہیں پیالی میں
ڈال دیں تو اختر نے پوچھا۔

"اچھا اگر میں آج سارا دن گھر سے باہر رہوں اور شام کو واپس آؤں
تو کیسے رہے؟"

"تو میں آپ سے ساری عمر نہ بولوں۔"

"ساری عمر!"

"ہاں۔"

"اچھا تو پھر ہم آج سارا دن گھر سے غائب رہیں گے۔ شام کو
لوٹیں گے۔ اور تمہیں منا بھی لیں گے۔"

"تو پھر میں تو کبھی بھی نہ بولوں۔"

"اچھا ہے میں کتنی منتیں کروں۔"

"ہاں۔"

"اچھا تو پھر ہو گیا سودا۔" اختر نے ہاتھ بڑھا کر کہا "آج تمہارا دم خم

بھی دیکھ ہی لیں گے۔"

سعیدہ نے اس کے ہاتھ سے انگلیاں چھڑا کر کہا "منظور ہے"

چچی ہو گئیں تو سعیدہ نے اپنی پیالی میز پر ڈالتے ہوئے کہا "امی دیر ہو گئی ہے میں تو چلتی ہوں۔"

اختر نے بھی اپنی پیالی واپس رکھتے ہوئے کہا "چچی میں بھی چلتا ہوں مجھے بھی دیر ہو رہی ہے۔"

چچی مسکراتے ہوئے بولیں "تجھے جا کر کونسی عدالت لگانی ہے چچا بیچارہ۔"

"عدالت نہیں لگانی" اختر نے سنجیدگی سے جواب دیا "منصف صاحب سے ملنا ہے۔ این۔ ڈی وامق صاحب سے۔"

چچی نے کہا "ہاں سچ تمہارا وامق صاحب ایک مرتبہ یہاں بھی آیا تھا۔ رنگ کو دوربین میں لگا کر دیکھنے والی بہت سی نظمیں دے گیا تھا۔"

"بس بس" اختر نے یوں ہی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا "اسی منصف سے ملنا ہے۔ بڑے کام کا آدمی ہے چچی۔ لیکن ہے ذرا غصہ ور۔ ایک مرتبہ روٹھ جائے تو منتا نہیں۔ اگر اسے پتہ چلا کہ میں یہاں آیا ہوں اور پہلے ہی دن اس سے نہیں ملا تو وہ ساری عمر نہیں بولے گا اور آج کل جو ایک بار روٹھ جاتا ہے وہ ساری عمر نہیں بولتا۔"

چچی نے کہا "شکل سے تو ایسا نہیں لگتا"

اختر نے گوشۂ چشم سے سعیدہ کو دیکھ کر کہا "چچی مصیبت تو یہی ہے کہ میرے سارے دوست شکل کے اور ہیں اور دل کے اور۔"

چچی نے کہا "ہمیں تو آج تک تیری طبیعت کا پتہ نہ چل سکا۔ تیرے دوست تو پھر غیر ہیں۔"

اختر نے جواب دیا "میری طبیعت کا کیا ہے۔ رنگ رنگیلی مہندی جیسی لال سرخ بیر بہوٹی۔"

چچی نے بڑے پیار سے تنک کر کہا "پرے ہٹ تیری باتیں تو ذرا بھی پلے نہیں پڑتیں۔"

اختر نے ہنستے ہوئے جواب دیا "چچی میری باتیں خاوند تھوڑی ہیں۔"

اس پر چچی کو ہنسی آ گئی۔ اور انہوں نے اختر کی کمر میں تھپڑ مار کر کہا "بکے جاتا ہے۔"

سعیدہ کتابیں اٹھائے اس کمرے کے سامنے سے گزر گئی۔ اختر کے دروازے سے گزرتے ہوئے اس نے اپنی رفتار اور بھی تیز کر دی اور سر کو دروازے کی مخالف سمت میں پھیر لیا۔ اختر صوفے میں دراز سگریٹ پی رہا تھا۔ سعیدہ کو اس طرح گزرتے ہوئے دیکھ کر اختر کو ہنسی آ گئی۔ وحیدہ نے بھی ایک بار ایسے ہی غصے کا مظاہرہ کیا تھا۔ بڑے سالوں کی بات ہے جب وہ ساتویں جماعت کا طالب علم تھا تو سارا خاندان آپی بھیا کی شادی پر جہلم میں اکٹھا ہوا تھا۔ وحیدہ اس سے عمر میں دو سال بڑی تھی۔ لیکن قد میں چھوٹی تھی۔

اور اختر اس لحاظ سے اسے اپنے سے چھوٹی ہی تصور کرتا رہا۔ ایک دوپہر جب وہ سنگار میز کے سامنے کھڑی پاؤڈر لگا رہی تھی تو اختر باہر صحن سے توے کی سیاہی ہاتھ پہ لگا کر اس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ کمرے میں لڑکیاں اور عورتیں آ جا رہی تھیں اور وہ موقعہ کی تلاش میں سمٹا سمٹا کر وحیدہ سے باتیں کر رہا تھا۔ جب چند لمحوں کے لئے کمرے میں کسی کا داخلہ نہ ہوا اور وحیدہ پاؤڈر لگا چکنے کے بعد ناخن پینٹ کرنے لگی تو اس نے سیاہی بھرا ہاتھ اس کے چہرے پر مل دیا۔ وحیدہ نے برش پھینک کر ایک زور کا تھپڑ اختر کے منہ پر مارا اور پھر رونے لگی۔ اختر ہنستا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ غسلخانے میں جا کر اپنا ہاتھ دھویا اور پانی بھرا لوٹا اور صابن دانی لے کر پھر اسی کمرے میں آ گیا۔ ایک لفظ بولے بغیر اس نے وحیدہ کا منہ دھلوایا اور جب وہ اُٹھنے لگی تو اختر نے ٹونٹی کی دھار سے تھوڑا سا پانی اس کے گریبان میں ڈال دیا۔ وہ گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گئی اور اختر بھاگ گیا۔ اس کے بعد سارا دن اس کے سامنے سے گزرتے ہوئے وحیدہ دوسری طرف منہ پھیر لیتی۔ شام کو وہ اکیلا دریا کی طرف نکل گیا اور چھوے میں بیٹھ کر رات ڈھلنے تک جہلم کی سیر کرتا رہا۔ اس کی غیر موجودگی میں بنارسی لنگڑے کا ایک ٹوکرا گھر پر آیا۔ سب نے خوب آم کھائے اور صحن میں جگہ جگہ چھلکوں اور گٹھلیوں کے انبار لگا دیئے۔ گھر پہنچ کر اسے شادی میں پکنے والے شوربے کی ایک پلیٹ چار پانچ پاپڑ ایسی روٹیوں اور آموں کی خوشبو کے علاوہ اور کچھ نہ ملا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ صحن کے آخری سرے میں اپنی کھری چارپائی پہ تکیہ دوہرا کر کے لیٹ گیا۔ وحیدہ صحن میں اِدھر اُدھر چکر کاٹ رہی تھی اور جب وہ اس کی چارپائی کے قریب سے

گزرتی تو غصے اور نفرت سے منہ ادھر پھیر لیتی۔ رات چھا گئی اور حقہ بجانے والوں نے اپنے فرشی حقوں کو چارپائیوں سے پرے دھکیل کر ان کی منہالیں اوپر آسمان کی طرف کر دیں اور خود کروٹ بدل کر نیند کی لپیٹ میں آنے لگے تو اختر کو اپنے سرہانے کسی کی موجودگی کا ہلکا سا احساس ہوا۔ لنگڑے کی جانفزا خوشبو کا ایک بھبھکا اس کے نتھنوں سے جیسے معدہ میں اتر گیا۔ اور پیشتر اس کے کہ وہ سر اٹھا کر دیکھ سکے ایک بڑا سا آم اس کے گال سے رگڑ کھا کر کندھے سے لگ گیا۔ اس نے ایک دم کہنی کا سہارا لیکر سر پھرا کر دیکھا۔ وحیدہ جا رہی تھی۔ اسی طرح منہ موڑے غصہ سے تنی ہوئی! اور ابھی جب سعیدہ اس کے سامنے سے گزری تھی تو وہ سوچنے لگا۔ کہ دونوں بہنوں کی غصیلی حرکات کتنی مشترک ہیں۔

سٹنڈو پہنچ کر اختر نے این ٹی واثق صاحب کا کمرہ دریافت کیا۔ اس وقت دن کے گیارہ بجے ہوں گے۔ واثق صاحب اپنی میز پر جھکے ہوئے نئی فلم کا سینریو لکھ رہے تھے۔ سگریٹوں کا ایک ڈبہ ان کے سامنے پڑا تھا۔ اور اندھے شیشے کی اتھاہ ایش ٹرے میں کناروں تک بیڑیوں کے ٹکڑے مردہ ٹڈیوں کی طرح پڑے تھے۔ کمرے میں داخل ہو کر اختر نے کہا۔ "بذکر تجی کی جے ہو۔"

واثق نے چونک کر دیکھا اور خوشی سے زور کا ایک نعرہ لگایا۔

گلے ملنے کے لئے وہ تیزی سے آگے بڑھا تو میز کے نوکیلے کونے نے اس کے کولہے پر ایک چبھتا ہوا بوسہ دیا۔ وامق ادھر توجہ دیئے بغیر اختر سے چمٹ گیا اور دونوں ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح گتھ گئے کہ بات کرنی اور سانس لینا دشوار ہو گیا۔ چند لمحوں تک یہی کیفیت رہی اور جب گرفت ڈھیلی ہوئی تو وامق نے بایاں ہاتھ نکال کر آہستہ آہستہ کولہا سہلانا شروع کر دیا۔ اسے ایک ہلکا سا دھکا دے کر اختر نے کہا" لن ترانی کے بچے پچھلے دنوں تو لاہور آیا اور مجھے اطلاع تک نہ دی۔"

وامق نے خفت سے ہنستے ہوئے کہا" اطلاع کیوں کر دیتا چاچا ایک رات وہاں رہا۔ اگلے دن سیٹھ کا تار آگیا۔ اور میں شام کی گاڑی سے بمبئی چل دیا۔"

"اور تو ایک دن میں مجھ سے نہیں مل سکتا تھا؟"

"مل تو سکتا تھا گروجی پر گھر سے نکلنا ہی نصیب نہ ہوا۔ دن بھر اماں اور بھابیوں سے شادی کے معاملے پر تکرار ہوتی رہی۔"

اختر نے تیوری چڑھا کر کہا "جھیص بیص کے گھوڑے! تجھے اپنی شادی ہم سے پیاری ہو گئی؟"

وامق ہنسنے لگا تو اختر نے سنجیدگی سے کہا" دیکھ تو بچو تیرے دفتر میں سب کو بتاتا ہوں کہ تو میٹرک فیل ہے اور تیرا نام نیاز ورک کی بجائے نظام دین ہے۔ آخر سالے یہ کیا سٹنٹ بنا رکھا ہے؟"

وامق نے ہنسی میں اضافہ کر دیا اور سر ہلا کر کہا" لالے ایسے ہی

کام چلتا ہے۔ یہ بمبئی ہے بمبئی۔"

اختر نے کہا" یہ بمبئی ہے تو چل چل کر بیئر پیتے ہیں۔"

وامق نے کہا" اور یہ سنز لیے؟"

"اوہ سنز لیے کی ماں کا ڈائیلاگ" اختر نے اس کا ہاتھ کھینچ کر کہا۔

کاغذوں اور فائلوں کو سمیٹ کر وامق نے دراز میں بند کیا اور اختر کو ساتھ لے کر ڈائریکٹر کے کمرے میں آگیا۔ ڈائریکٹر ڈانس ماسٹر سے باتیں کر رہا تھا۔ سامنے کے بڑے صوفے پر ایک مارواڑی نوجوان سویا ہوا تھا۔ اور اس کے ساتھ پاپ کی آرام کرسی پر ایک سانولی سی لڑکی اپنے پرس کو کھولنے اور بند کرنے میں مصروف تھی۔ وامق نے ہاتھ اٹھا کر اسے سلام کیا اور لڑکی نے سر کی جنبش سے مسکرا کر جواب دیا۔ اختر کی طرف جھک کر وامق نے آہستہ سے کہا۔

"اس لڑکی کو اچھی طرح سے دیکھ لو۔"

ڈانس ماسٹر اپنی تقریر ختم کر چکا تھا اور تین مرتبہ سلام کرنے کے باوجود ابھی تک وہیں تھا ہر سلام کے بعد ڈائریکٹر پھر اس سے بے معنی سی گفتگو شروع کر دیتا۔ جب چوتھی مرتبہ سلام کر کے ڈانس ماسٹر واقعی کمرے سے باہر نکل گیا تو ڈائریکٹر نے وامق کو دیکھ کر کہا" اچھا فرمائیے۔"

وامق نے بڑی لجاجت سے کہا" عرض یہ ہے کہ میرے یہ دوست پنجاب سے تشریف لائے ہیں اور شاپنگ کے لئے مجھے اپنے ساتھ لے جا رہے ہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں ان کے ساتھ چلا جاؤں۔ لنچ کے

بعد آجاؤں گا۔"

"لنچ کے بعد آجائے گا نا؟" ڈائریکٹر صاحب نے ایک چٹھی پڑھتے ہوئے پوچھا۔

"ضرور آجاؤں گا" وامق نے وثوق سے کہا۔ "بلکہ اس سے پہلے ہی پہنچ جاؤں گا۔"

ڈائریکٹر نے کاغذ سے نظریں اٹھائے بغیر کہا۔ "تو جاؤ"

اور دونوں اس کے کمرے سے باہر نکل آئے۔

بار کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے وامق نے کہا۔ "لالے بیئر پی کر مجھے رونا آجاتا ہے۔ آج میں حتی الامکان ضبط کرنے کی کوشش کروں گا۔ اگر میرے پانچ چھ آنسو نکل پڑیں تو تمہیں کوئی اعتراض تو نہ ہوگا"

اختر نے کہا۔ "پانچ چھ تو کیا مجھے پچاس ساٹھ آنسوؤں پر بھی اعتراض نہ ہوگا۔"

گھٹیا سی بار تھی۔ متوسط طبقے کے نچلے درجے والے لوگ یہاں آکر سستی قسم کی شراب پیا کرتے تھے۔ وامق اور اختر بھی ایک کیبن میں بیٹھ گئے۔ وامق نے دیسی بیئر کا آرڈر دیا اور جب لڑکا گلاس اور بوتل لے کر آگیا تو وامق نے پوچھا۔

"اختر تم نے کب پینی شروع کی"

اختر نے مسکرا کر جواب دیا۔ "ابھی تک تو منہ نہیں لگایا۔ اس وقت سے پینی شروع کروں گا۔"

وامق نے کہا۔ "دفتر میں تو تُو نے ایسے کہا تھا جیسے ازل کا شرابی ہو"

اختر نے کھنکار کر کہا۔ "دفتروں میں ایسے ہی کہا جاتا ہے پیارے۔"

جب دونوں گلاس بھر چکے اور بیئر کا جھاگ کناروں سے امڈ کر میز پر پھیل گیا تو وامق نے کہا۔ "تو نے وہ لڑکی دیکھی ہے؟"

"ہوں"

"کیسی ہے تیرے خیال میں؟"

"جیسی لڑکیاں ہوا کرتی ہیں"

"پھر بھی؟"

"بھئی جیسی ہوا کرتی ہیں، پھر بھی کیا"

وامق نے کہا۔ "یار یوں تو نہ کہو۔ وہ تو ایک چیز ہے۔ ایک ایسی چیز جسے قدرت نے سوندھی سوندھی مٹی سے بنا کر سونگھنے کے لئے رکھا ہو اور جو ابھی ٹھیک سے نہ سونگھی ہو۔"

اختر کو ہنسی آگئی۔ اس نے گلاس منہ سے لگا کر دو بڑے بڑے گھونٹ بھرے اور کہا۔

"سالے یہ تیرے سیٹھ کا سٹوڈیو نہیں۔ لڑکی کی بات کر۔ ڈائیلاگ نہ بول۔"

وامق نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "میں ڈائیلاگ بول رہا ہوں ظالم! میں تو اس پری وش کا ذکر کر رہا ہوں۔ سیدھے سادے الفاظ میں اس کا نقشہ کھینچ رہا ہوں۔"

"تجھے اچھی لگتی ہے وہ لڑکی؟" اختر نے پوچھا۔

"اچھی؟" وامق نے زور دے کر کہا۔ "اختر تمہاری قسم میں جب اسے دیکھتا ہوں تو میرا نماز پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔"

اختر نے کہا: "خیر پھر تو ایسی کوئی بات نہیں۔ لیکن مجھے ڈر لگ رہا ہے، کہ کسی دن اسے دیکھ کر تجھے سنکھ بجانے کا شوق نہ چرانے لگے۔ اور تو گلے میں سکاؤٹوں کی طرح بگل ڈالے لفٹ رائٹ کرتا پھرے۔"

وامق نے گلاس ختم کر کے کہا: "تو بھی میرا مذاق اڑانے لگا۔ میری محبت کی تذلیل کرنے لگا۔"

اختر نے اس کا گلاس بھر کر بوتل کو زور سے میز پر مارا اور کہا: "او نظام دین! او بچے سقے کی اولاد! سن محبت کی رٹ لگانے والا آدمی مجھے اس ریکارڈ کی طرح لگتا ہے جس کا گروو خراب ہو گیا ہو اور ـــ ساؤنڈ بکس کی سوئی اس ایک ہی چکر میں گھوم کر محبت محبت پکارنے لگی ہو۔ میں نہ تو محبت کا قائل ہوں اور نہ محبت کھایا اور رکھنے کو جائز سمجھتا ہوں۔ محبوب بن سکتے ہو تو عاشق بننے کی کوشش نہ کرو۔ چکورے چاند بھلا۔ ایسے پھول بنو جس پہ ہزاروں بلبل اپنی جان لٹا دیں۔"

وامق نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا: "اور اگر کوئی پھول نہ بن سکتا ہو تو؟"

"تو وہ نقلی پھول بن جائے۔" اختر نے کاگ دباتے ہوئے کہا: "رنگ برنگے کاغذ کا۔ پتے کی کترنوں کا۔ شوکیس بن جاؤ نظام دین شوکیس۔ بلبل خوشبو کا دیوانہ نہیں ہوتا۔ جلوے بازی پہ مرتا ہے۔ جیسے تم نے این ڈی سوامق والی ڈنس

چلا رکھی ہے ایسے ہی محبوبیت کی کوئی بزنس چلاؤ۔"

وامق نے اپنے سینے پر زور سے گھونسہ مار کر کہا: "مرد بھی کبھی محبوب ہوا ہے؟"

"جبھی تو میں کہتا ہوں۔" اختر نے ہنس کر کہا۔ "مرد ازل سے آج تک عاشق ہی بنا رہا۔ دنیا بنے ہزاروں سال گزر گئے۔ ہر چیز بدل گئی لیکن اس نے اپنی فطرت نہ بدلی۔ عورتوں نے اس کی کمزوری سے خوب فائدے اٹھائے لیکن اب وقت آگیا ہے کہ ہم اپنی طبیعت پر ذرا سا جبر کر کے ان سے دو دو ہاتھ کریں۔ اور تم کیا جانو نظام دین جب یہ کڑیاں چڑیاں ہجر کی ایک کالی رات کاٹیں گی تو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا۔"

نظام دین یہ باتیں سن کر زار زار رونے لگا۔ اس نے اپنے سامنے پڑے ہوئے گلاس کی بیئر زمین پہ گرا دی اور میز پہ سر رکھ دیا۔ اختر نے اسے ہلا کر کہا۔

"سن بیٹا جس ایکسٹرا لڑکی کے لئے تو یوں ہلکان ہو رہا ہے وہ سیٹھ کے بیٹے کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کر رہی ہو گی۔ اس کو اپنی طرح بیقرار بنانا ہے تو لوگوں کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کر لیکن اس سے کھنچ کر رہ اس کی موجودگی میں محفل کا دولہا بن جا لیکن اس کی طرف توجہ نہ کر اور اگر ـــ"

وامق نے میز سے سر اٹھا کر بات کاٹتے ہوئے پوچھا: "اور اگر وہ پھر بھی نہ چاہے تو؟"

اختر نے کہا: "الو کے پٹھے! وہ نہ چاہے تیری بلا سے۔ پر تو چاہے

انے کے انداز پیدا کئے جا۔"

وامق نے اختر کو اس کی جنس بدل دینے والی گالی دے کر کہا: "اگر ری شکل میرے جیسی ہوتی پھر دیکھتا تو کسی کو یہ نسخہ کیسے بتاتا۔"

اختر ہنس پڑا۔ اس نے وامق کے کندھے پر زور سے ہاتھ مار کر کہا نظام دینا! تپا ہونے کی کوئی بات نہیں۔ یہ لیلیٰ تیری پھوپھی کوئی حور یا پری تو نہ تھی کہ بھائی صاحب کو خاک چھنوا کر مار دیا اور وہ شیریں ہو گی کوئی کوتاہ جبین، موٹی سی ناک والی لڑکی جس کے وصال کی جھوٹی خبر سن کر حضرت صاحب تیشے سے سر پھوڑ کر فوت ہو گئے اور آخر میں یاران سب کی مرشدہ کلو پیٹرا۔ تم نے توت عنخ کی تصویریں تو دیکھی ہی ہوں گی۔ کیا ہو گی بھلا وہ بھی؟

وامق چپ رہا۔

اختر نے اس کا شانہ ہلا کر پوچھا: "دیکھی ہیں نا ان کی تصویریں؟"

"دیکھی ہیں۔" وامق نے اسی طرح جواب دیا۔

"تو کیا ہو گی بھلا وہ؟"

"چاند کا ٹکڑا" وامق نے روہانسی آواز میں جواب دیا۔

اختر نے ہنس کر کہا: "بس جی لیا تینے تو مورے لال۔"

اس کے بعد ان کے درمیان کوئی بات نہ ہوئی۔ ایک بوتل بیئر کی اور نگوائی گئی۔ اور وہ دونوں اپنے اپنے خیالات میں مگن چھوٹی چھوٹی چسکیاں کر تلخ مشروب پیتے رہے۔ جب بار کے کلاک نے دو بجائے تو وامق نے ال سے اپنا منہ پونچھ کر کہا: "اچھا لالے میں تو چلتا ہوں۔"

"کھانا نہیں کھائے گا کیا؟" اختر نے پوچھا۔

"اوں ہوں"

"تو آج بھوکا ہی رہے گا؟"

"نہیں۔ دفتر میں منگوا لوں گا۔ تو یہ بتا کہ جا کب رہا ہے؟"

اختر نے ذرا دیر سوچنے کے بعد کہا: "جانے سے ایک روز پیشتر تجھے اطلاع کر دوں گا۔"

وامق نے پوچھا: "اور اگر تو بھول گیا تو؟"

"تو سیدھی بات ہے۔" اختر نے تسمہ کستے ہوئے کہا: "تجھ لینا کہ لا اگر تو نے مجھے جو اطلاع نہ کی تھی اس کا بدلہ چک گیا۔"

"اوں ہوں۔" وامق نے تنبیہ کرتے ہوئے کہا: "وہ بدلہ پھر کبھی سہی اس مرتبہ مجھے ضرور اطلاع کرنا۔"

"بہت اچھا۔" اختر نے اپنی دونوں ٹانگیں میز پر رکھ لیں اور ڈبے سے آخری سگریٹ نکال کر سلگا لی۔

جب اختر گھر لوٹا تو بتیاں جل چکی تھیں۔ لمبے برآمدے کے آخری کونے پر سعیدہ پھولوں کی کیاری کی طرف منہ کئے کھڑی تھی۔ اختر پنجوں کے بل چلتا ہوا آہستہ آہستہ اس کے قریب پہنچا اور اسے بازوؤں میں لے لیا۔ وہ بجلی کی طرح تڑپی اور کیاری میں کود گئی۔ اختر نے آہستہ سے اسے آواز دی۔ لیکن وہ تیزی

ے کچن کی طرف چلی گئی۔ اسی کونے کے ساتھ والے کمرے میں بتی جل رہی
تھی اور پنکھے کے نیچے چچا جان، چچی اور گگو کھانے کی میز کے ارد گرد اس کا انتظار
کر رہے تھے۔ کمرے میں داخل ہو کر اختر نے معذرت کے طور پر دو چار جملے
کہے اور اپنا تھیلا چھوٹی میز پر ڈال کر ایک کرسی پر ڈٹ گیا۔ چچا جان نے بیرے
کو آواز دی اور جب وہ کھانے کی ٹرے لے کر اندر آیا تو اس کے ساتھ سعیدہ
بھی داخل ہوئی۔ کھانا کھا چکنے کے بعد اختر نے اپنا تھیلا اٹھایا اور چاکلیٹ
کا ایک بڑا سا پیکٹ نکال کر میز کے بیچوں بیچ رکھ دیا۔

"اوہ مسٹر" چچا جان نے خوش ہو کر کہا "گڈ۔ ویری گڈ"۔

گگو نے لالچ بھری نگاہوں سے اپنے ابا کو پیکٹ کھولتے ہوئے
دیکھا اور اختر کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔ چاکلیٹ نکال کر چچا جان نے
اسے درمیان سے توڑا اور آدھا اپنی بیوی کو دے کر باقی خود کھانے لگے۔ چچی
نے ایک ٹکیہ توڑ کر گگو کو دی اور تین ٹکیوں والی ایک قاش اختر کو دے کر باقی
آپ کھانے لگیں۔ اختر نے ایک ٹکیہ توڑ کر دانتوں میں دبائی اور دو ٹکیاں سعیدہ
کو دیتے ہوئے کہا "تم بھی دیکھو سعیدہ بڑے معرکے کی چیز ہے"۔

سعیدہ نے بڑے تصنع کے ساتھ کہا "جی شکریہ، میرا گلا خراب ہے"۔

"پھر تو اور بھی اچھی بات ہے" اختر نے سفارش کرتے ہوئے کہا۔
"اس میں چند اجزا ایسے ملائے جاتے ہیں جو گلے کی ہر بیماری کا علاج ہیں منبلز
کھا کر تو آدمی خواہ مخواہ پکا گانا گانے لگتا ہے"۔

چچا جان زور زور سے ہنسنے لگے۔ سعیدہ ہچکچائی تو چچی نے کہا۔

ے لو بیٹا"۔

سعیدہ نے منمناتے ہوئے کہا "امی میرا جی نہیں چاہتا"۔

"پھر ٹھیک ہے"۔ اختر نے دونوں ٹکیاں ایک ساتھ چباتے ہوئے
کہا "جی نہ چاہتا ہو تو یہ چیز بے حد نقصان پہنچاتی ہے"۔

اختر غسلخانے میں کھڑا ہاتھ دھو رہا تھا کہ سعیدہ تولیہ لینے کے لئے
اندر داخل ہوئی۔ اختر نے ہاتھ بڑھا کر مضبوطی سے اس کی کلائی پکڑ لی۔

"چھوڑیئے" سعیدہ نے زور لگاتے ہوئے کہا۔

"اوں ہوں" اختر نے نفی میں سر ہلایا۔

سعیدہ نے تیوری چڑھا کر کہا "چھوڑیئے میں نہیں بولتی"۔

اختر نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا "ایک بات تو سنو"۔

"نہیں۔ میں نہیں سنتی" سعیدہ اسی طرح زور لگاتی رہی۔

"ایک بات۔ چھوٹی سی بات"۔

"اونہوں۔ میں نہیں سنتی"۔

"اچھا ننھی سی بات"۔

"کہہ جو دیا میں نے۔ نہیں سنتی"۔

اختر نے زور سے اس کا ہاتھ جھٹک کر کہا "نہیں سنتی تو جاؤ نہ سنو"
اور بڑبڑاتا ہوا غسلخانے سے باہر نکل گیا۔

سگریٹ سلگا کر اختر اپنے کمرے میں آ کر پلنگ پر لیٹ گیا۔ جوں
ہی سگریٹ ختم ہوئی اس نے اٹھ کر بتی بجھائی اور بستر پر دراز ہو کر تکیہ دہرا کر کے

سر کے نیچے رکھ لیا۔ چند لمحوں بعد اختر نے دیوار کی طرف کروٹ بدل کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے اٹیچی کیس میں دو پوری موم بتیاں پڑی تھیں۔ لیکن آج اس نے انہیں روشن کرنا مناسب نہ سمجھا اور اسی طرح اندھیرے میں سونے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن موم بتی کا سفید سفید وجود اور اس کی مدھم مدھم روشنی اختر کے لئے لوری کی تاثیر رکھتی تھی اور آج وہ لوری سے محروم ہو کر اندھیرے میں ٹکریں مار رہا تھا۔ اچانک اس نے اپنے کندھے پر ایک ہاتھ کی ہلکی سی گرفت محسوس کی۔ اختر نے پلٹ کر دیکھا۔ سعیدہ اس پر جھکی کھڑی تھی اور اس کا دوپٹہ کندھے پر سے ہوتا ہوا اختر کے بستر پہ آ کر گر رہا تھا۔

"روٹھ گئے؟" سعیدہ نے دبی زبان میں پوچھا۔

"ہاں"۔ اختر نے پھر دیوار کی طرف منہ کر لیا۔

"بس اتنی سی بات پر؟"

"ہاں اتنی سی بات پر۔" اختر نے اسی طرح جواب دیا۔

سعیدہ نے اپنا ماتھا اختر کی کنپٹی پر رکھ دیا اور اس کی زبان سے ٹوٹے پھوٹے الفاظ کا دھارا بہہ نکلا۔

"میں مر جاؤں گی اترجی میں مر جاؤں گی۔ تم مجھ سے روٹھے کیوں ہو؟ بولو اترجی بولو۔ اترجی تم مجھ سے بولتے کیوں نہیں؟"

اختر نے آہستہ سے اس کا کندھا تھپتھپانا شروع کر دیا اور کہنے لگا: "بولتا ہوں۔ بولتا کیوں نہیں۔ تم ہی تو مجھ سے بیگانگی برتنے لگی ہو۔ تمہیں تو میں اچھا ہی نہیں لگتا۔" سعیدہ نے اس کے منہ پہ ہاتھ رکھ دیا اور اپنے نتھنوں اور منہ سے ایک ہی سانس چھوڑ کر بولی۔

لگتے ہو اترجی لگتے ہو۔ تم تو میرے چاند ہو۔ میری دنیا ہو۔ اترجی مجھ سے روٹھا نہ کرو۔ چندے جی مجھ سے ناراض نہ ہوا کرو۔ بتاؤ بولتے ہو نا؟"

اختر نے اس کو اسی طرح تھپتھپاتے ہوئے کہا: "بولتا ہوں۔ بولتا ہوں تم سے نہیں بولوں گا تو اور کس سے بولوں گا۔ تم تو میری سعیدہ ہو۔ میری ہو نا؟"

سعیدہ نے کوئی جواب نہ دیا اور اسی طرح سر رکھے لمبی لمبی سانسیں لینے لگی جب آنسوؤں کے چند موٹے موٹے قطرے ایک دم اس کی آنکھوں سے پھسل کر اختر کی کنپٹی پہ پھیل گئے تو وہ تڑپ کر اٹھا۔ اس نے سعیدہ کو اپنی آغوش میں لے لیا اور اس کی آنکھیں چوم کر کہنے لگا۔

"یہ تم رونے کیوں لگی ہو۔ میں روٹھا ہی تھا مر تو نہیں گیا تھا۔"

مرنے کا نام سن کر سعیدہ نے پھر اس کے منہ پہ ہاتھ رکھ دیا اور دھیمی دھیمی سسکیاں بھرتے ہوئے کہا: "ایسے نہ کہو اترجی میں مر جاؤں گی۔ تم سے کبھی نہ بولوں گی۔ مرنے کا نام لو گے تو میں روٹھ جاؤں گی۔"

اختر نے مسکرا کر کہا: "اچھا پھر نہیں کہتا۔"

سعیدہ اس کی گود میں آرام سے پڑی تھی۔ چند سیکنڈ اسی طرح گزر گئے اختر نے آہستہ سے پوچھا "سب لوگ کہاں گئے؟"

سعیدہ نے اسی طرح اپنے خیالات میں گم جواب دیا: "بچے اور نوکر لوگ سو گئے ہیں۔ اور امی ابا جان کی ٹانگیں دبا رہی ہے۔"

اختر نے کہا: "اور تمہیں ڈر نہیں لگ رہا؟"

"لگ رہا ہے۔" سعیدہ نے معصومیت سے جواب دیا۔

"تو تم جاکر سوتی کیوں نہیں؟" اختر نے پوچھا۔

"مجھے نیند نہیں آتی۔" سعیدہ نے بھولپن سے کہا۔

اختر نے پوچھا "تمہیں آیۃ الکرسی آتی ہے؟"

"آتی ہے۔"

"تو تین مرتبہ پڑھ کر اپنے سینے پر دم کرو۔ آپ ہی آپ نیند آجائے گی۔"

سعیدہ نے اختر کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر اپنی طرف کھینچا۔ اس کی پیشانی، دونوں آنکھوں اور ٹھوڑی کو بوسہ دے کر بولی۔

"اب آجائے گی نیند۔"

وہ اٹھ کر جانے لگی تو اختر بھی چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ دروازے کے پاس اس نے سعیدہ کو اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ اور اس کے کان کے پاس منہ لے جاکر بولا۔

"مجھے بھول تو نہ جاؤ گی سعیدہ؟"

سعیدہ نے رکتے رکتے کہا "تم بھول جاؤ گے —— تم ہی بھلا دینے ہو اختر جی۔ میں تو تمہیں ہر وقت یاد کرتی رہتی ہوں۔ میں تو ہر روز تمہارا انتظار کیا کرتی ہوں۔"

اختر نے کہا "اور تمہارا خیال ہے کہ میں تمہیں یاد نہیں کرتا؟"

"ہاں" سعیدہ نے یقین سے کہا "اختر جی تم دوستوں میں پہنچ کر مجھے یاد نہیں کرتے، اپنی سہیلیوں سے مل کر مجھے بھلا دیتے ہو۔ میرا جی چاہتا ہے کہ ان سب کو زہر دے دوں۔ ان سب کا گلا گھونٹ دوں۔"

اختر نے ہنس کر اسے زور سے بھینچ لیا اور کہا "پھر وہی بات!"

تیسرے دن وامق اختر کے یہاں آیا۔ اس نے آتے ہی گالیوں کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ اور اپنے آپ کو کوسنے لگا کہ اس نے خواہ مخواہ اختر ایسے آدمی کو اپنا اصلاح کار بنا کر وقت ضائع کیا۔ اختر ہنس ہنس کر گنواروں کی طرح سگریٹ پی رہا تھا۔ اور وامق کہہ رہا تھا۔

"الو کے تاؤ تو نے مجھے بال دھوا کر دیا۔ مس ابیکر پہلے مجھ سے ہنس کر بات کیا کرتی تھی لیکن جب سے میں نے محبوبیت کے مظاہرے شروع کئے ہیں وہ مجھے دش بھی نہیں کرتی اگر چند دن اور یہی حال رہا تو میں کچھ کھا کر سو رہوں گا۔"

"تو کوئی انوکھی بات نہیں کرو گے۔" اختر نے اس طرح کش لگاتے ہوئے کہا۔ "پہلے مرد بھی اسی طرح کرتے آئے ہیں۔ مزا تو جب ہے کہ اسے کچھ کھا کر سو رہنے پر مجبور کر دو۔"

وامق نے تنگ کر کہا "بکواس نہ کر۔ کبھی شیشے میں اپنی صورت دیکھی ہے۔ باپ دادا ساری عمر ہلدی کا بیوپار کرتے رہے اور صاحبزادے کو یوسف بننے کا شوق چرایا ہے۔"

اختر نے کہا "یوسف بننے کا شوق تو مجھے جب چرایا اگر میں یوسف نہ ہوتا۔ ارے میں یوسف بہ قیمت اول خریدہ ہوں۔"

وامق نے آہ بھر کر کہا "ٹھیک کہتے ہو سالے۔ سفید رنگ ہے۔ کنجی آنکھیں اور بھورے بھورے بال معشوق نہ بنو گے تو کیا تھانیدار بنو گے۔"

"یہ بات نہیں"، اختر نے کرسی اس کے قریب کھینچ لی "محبت کے کھیل میں شکل و صورت بے معنی سی چیز ہے۔ یہاں تو اور ہی طرح کے گل بوٹے بہار دکھاتے ہیں۔"

"کہاں سے ملتی ہے ایسے گل بوٹوں کی پنیری؟" وامق نے بات کاٹ کر پوچھا۔

اختر مسکرا دیا اور چٹکی بجا کر راکھ جھاڑتے ہوئے بولا "یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں۔ پر ایسی پنیری ہوتی ضرور ہے۔ کبھی کبھار تو یہ بوٹے انسان کی فطرت میں خودرو گلاب کی طرح پنپ جاتے ہیں اور کبھی ان کی قلمیں لگا کر بھی انہیں پروان چڑھایا جاتا ہے۔"

وامق نے کہا "تیرے پاس دو چار ایسی قلمیں ہوں تو مجھے بھی دیدے۔ آخر تم کس دن میرے کام آؤ گے؟"

"پتہ نہیں"، اختر نے کہا "کہ میرے پاس ایسی قلمیں ہیں کہ نہیں لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ ایک نہ ایک دن کسی لڑکی کو کرب کی اندھیری راتوں میں دھکا دے کر اس کی جان لے لوں گا۔"

"جان لے لو گے؟" وامق نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں" اختر نے منہ بگاڑ کر کہا "جب بڑے بڑے جگر دار سورما سینے میں چھری بھونک کر ختم ہو گئے تو ان کڑیوں چڑیوں کا کیا ہے۔"

وامق چپ ہو گیا۔

اختر نے کہنا شروع کیا "آخر ان کے سینوں میں بھی تو دل ہوتا ہے۔ وہ

بھی تو ہم جیسی آنکھیں اور ہمارے ایسی کیفیات رکھتی ہیں۔ پھر وہ بھلا عاشق کیوں نہیں ہو سکتیں۔ یہ کیا کہ ہر بار مرد ہی اقدام کرے!"

پھر اس نے ذرا سوچ کر کہا "یاد رکھنا وامق میری زندگی کا وہ کامیاب ترین دن ہو گا جب کوئی چڑیا مجھ سے والہانہ محبت کرنے لگے گی اور کسی نہ کسی وجہ سے مجبور ہو کر زہر پھانک لے گی۔ اس کے بعد چاہے میں سمندر میں کود جاؤں یا گلے میں پھندا ڈال کر لٹک جاؤں مجھے ذرا بھی ملال نہ ہو گا۔ آخر وہ بھی تو محبت کریں۔ وہ بھی تو تکالیف اٹھائیں۔"

وامق چپکے سے اٹھا۔ میز پر پڑے ہوئے سگریٹ کیس سے ایک سگریٹ نکالا اور بولا۔

"یار تمہاری یہ باتیں میری سمجھ سے بالا ہیں۔" پھر ماچس کی تلاش میں اپنی جیبیں ٹٹولتا اسی طرح کمرے سے باہر نکل گیا۔

روانگی سے ایک دن قبل اختر کو ایک نئی گھڑی خریدنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس نے ایک ٹیکسی پکڑی اور ہارنبی روڈ کی طرف نکل گیا۔ دو دو دکانیں چھاننے کے بعد اس نے آخر کار ایک معمولی سی گھڑی انتخاب کی۔ یہ نئی گھڑی اس کی پرانی گھڑی سے کافی گھٹیا تھی لیکن چونکہ نئی تھی اور جدید طرز پر بنی ہوئی تھی اس لیے اختر نے اسے انتخاب کیا۔ سیلز گرل کوئی پارسی لڑکی تھی۔ جب اس نے کیش میمو کے ساتھ ڈبیا اسے دینا چاہی تو اختر نے اسے ہاتھ میں لینے کی بجائے اپنی کلائی آگے بڑھا دی اور کہا۔

"تکلیف نہ ہو تو اسے یہاں باندھ دیجیے۔"

لڑکی مسکرائی اس نے کیش میمو شو کیس پر رکھ کر ڈبیا کھولی اور اختر کی آستین کافی دور تک ہٹا کر گھڑی اس کی کلائی پر باندھ دی۔ گھڑی بندھوا چکنے کے بعد اختر نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اپنی پرانی گھڑی جیب سے نکال کر کہا۔

"تم برا نہ مانو گی۔ اگر یہ گھڑی میں تحفے کے طور پر تمہیں دے دوں؟"

لڑکی نے مڑ کر پرے کونے میں بیٹھے ہوئے سیٹھ کو دیکھا اور مسکرا کر کہا۔

"نو تھینکس"

اختر نے کہا۔ "آخر اس میں ہرج ہی کیا ہے۔ یہ گھڑی مجھے بہت عزیز ہے اور میں لندن جا رہا ہوں۔ اگر خدا نخواستہ جہاز راستے میں ڈوب گیا تو مجھے اس گھڑی کے غرق ہونے کا بہت صدمہ ہوگا۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ ہندوستان ہی میں رہے۔" لڑکی ہنس پڑی۔ اس نے جواب دینے کے لئے اپنے لب کھولے بھی لیکن اس سے کوئی جواب بن نہ پڑا۔ اور اس نے گھڑی اختر کے ہاتھ سے لے لی۔ اختر نے کہا۔

"میری وصیت ہے کہ یہ گھڑی ہندوستان سے باہر نہ جائے۔"

گھڑی کو غور سے دیکھتے ہوئے لڑکی نے آہستہ سے اچھا کہا اور اختر ہاتھ لہراتا دکان سے نکل گیا۔

واپسی پر اختر نے سوچا کہ چلو لگے ہاتھوں چچا جان کے دفتر کا بھی ایک چکر ہو جائے۔ اس دفعہ اس نے وکٹوریہ کی سواری کو ترجیح دی اور اپنی نئی گھڑی کو بار بار کان سے لگاتا ہوا ایک وکٹوریہ میں بیٹھ گیا۔

چچا جان نے عینک اتار کر کہا۔ "تم کل جا رہے ہو؟"

"جی" اختر نے گلا صاف کر کے کہا۔

چچا جان نے گھنٹی بجا کر اپنے پی۔ اے کو بلایا اور کہا۔ "مسٹر ورما کل میرا بھتیجا انگلینڈ جا رہا ہے۔ میں دفتر نہ آسکوں گا۔ کوئی ضروری کاغذ ہو تو ابھی لے آؤ۔"

مسٹر ورما نے سر کھجا کر کہا "جی کوئی ایسا ضروری کاغذ تو ہے نہیں اگر ہوا تو میں کل بنگلے پر آکر دستخط لے لوں گا۔" پی۔ اے چلا گیا تو چچا جان نے کہا۔ "میری رائے تو یہ تھی کہ تم شادی کر کے انگلینڈ جاتے لیکن خیر اب چونکہ اتنی جلدی یہ بندوبست نہیں ہو سکتا۔ یوں ہی سہی۔"

اختر سر جھکا کر ہنستا رہا۔

چچا جان نے پھر کہنا شروع کیا۔ "بات یہ ہے بیٹا کہ ہم مشرقی لوگ کنوارے آدمی کا ولایت جانا مناسب نہیں سمجھتے۔ یہ فرنگنیں کم بخت ایسی ہوائی دیدہ ہوتی ہیں کہ بھولے بھالے ہندوستانیوں کو یوں پھانس لیتی ہیں —— آخر بھائی صاحب نے تمہارے لئے کوئی لڑکی انتخاب بھی کی؟"

"ابھی تک تو نہیں جی" اختر نے دلہن کی طرح شرماتے ہوئے کہا۔

"آخر کیوں؟" چچا جان نے ذرا رعب سے پوچھا۔

"بس جی یوں ہی —— مجھے تو معلوم نہیں!"

چچا جان کہنے لگے "یہ خوب ہے۔ بھائی صاحب بھی کمال کرتے ہیں —— لیکن خیر مجھے کیا۔ انہیں تو اپنے دوستوں کی لڑکیاں اپنے گھر کی

بیٹیوں سے اچھی لگتی ہیں۔ ان میں سے ہی کسی کے ساتھ کردی ہوتی ——؟
شکور صاحب کہاں ہوتے ہیں آج کل؟

"پنڈی میں ہیں جی شاید۔"

اختر نے شاید کو حذف کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔

"تو پھر؟"

"کچھ نہیں جی۔" اختر نے گھبرا کر کہا۔

بات کا رُخ بدلنے کے لئے چچا جان نے کہا: "اچھا بھئی تمہارا جہاز کس وقت جا رہا ہے؟"

"کل شام کے چھ بجے۔"

"تو ٹھیک ہے۔ پھر تو رحیدہ کی امی بھی تمہیں سوار کرانے چل سکتی ہیں۔"

اس کے بعد چچا جان خاموش ہو کر اپنے کاغذوں پر جھک گئے۔

اختر ان سے اجازت لے کر سیدھا گھر پہنچا۔ چچی کہیں گئی ہوئی تھیں۔ گڈو ایک کمرے میں اکیلا بیٹھا لوڈو کھیل رہا تھا۔ اور سعیدہ کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اختر کپڑے بدلنے کے لئے اپنے کمرے میں داخل ہوا تو سعیدہ کو اپنی کرسی پر بیٹھے پایا۔ وہ دروازے کی طرف پشت کئے ٹھوڑی زانوؤں پر ٹکائے گم سم بیٹھی تھی۔ اس نے دونوں پاؤں چارپائی کی پٹی پر رکھے ہوئے تھے اور اس کے سفید کبوتروں جیسے سینڈل زمین پر اُلٹے پڑے تھے۔ آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتے ہوئے اختر اس کے پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا اور اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ سعیدہ کی آنکھیں اور گال بھیگے ہوئے تھے۔ اختر نے فوراً اپنا ہاتھ ہٹا کر اس

کی ٹھوڑی اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"یہ منا منا شار و نا کیوں آ گیا؟"

سعیدہ زور لگا کر اپنی ٹھوڑی نیچے کرنے لگی۔ اختر نے اسے مضبوطی سے تھامے رکھا اور برابر کہے گیا۔

"کیوں جی! کیوں جی!! منا منا شار و نا کیوں آ گیا؟"

اس پر بھی سعیدہ اسی طرح بیٹھی رہی تو اختر نے اس کے گدگدیاں کرنی شروع کر دیں۔ پر آج نہ جانے اس نے بے ہوشی کی کون سی دوا پی لی تھی کہ اتنی ساری گدگدیوں کا اس پہ کوئی اثر ہی نہ ہوا۔ اختر نے اپنی ٹھوڑی سعیدہ کی مانگ پر ٹکا کر سر زور زور سے ہلانا شروع کر دیا۔

"بولو جی، سعیدہ جی بات کرو، بولو نا کیا ہوا ہے۔ بتاؤ جی، نہیں تو ہم تم سے ناراض ہو جائیں گے۔" بھلا اس میں پوچھنے کی کیا بات تھی! اختر اچھی طرح سے جانتا تھا کہ سعیدہ کیوں رو رہی ہے۔ لیکن وہ اس کے منہ سے سب کچھ کہلوا کر اپنی تسکین چاہتا تھا۔ اپنے کانوں کو سعیدہ کی معذوریاں خود اس کے منہ سے سنوا کر جی خوش کرنا چاہتا تھا اور جب اختر نے آخری فقرہ "نہیں تو ہم تم سے ناراض ہو جائیں گے۔" کہہ کر ٹھوڑی سعیدہ کے سر سے اٹھالی تو سعیدہ تڑپ کر اٹھی اور اپنے مخروطی ہاتھ اختر کے سامنے جوڑ کر کہنے لگی۔

"یوں نہ کہا کرو اختر جی۔ ایسے الفاظ سن کر میری جان نکل جاتی ہے۔ کاش میں تمہیں ناراض دیکھنے سے پہلے ہی مر جاؤں۔ اختر جی مجھے پتہ ہے تم مجھ سے کبھی ناراض نہ ہو گے۔ تم صرف مجھے ڈراتے رہتے ہو اور میں ڈرتی رہتی ہوں۔"

اختر نے سعیدہ کو اپنے ساتھ لگا کر بچے کی طرح تھپکتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو رو کیوں رہی تھی؟"

سعیدہ نے کہا: "تم کل چلے جاؤ گے۔ اور میں اکیلی رہ جاؤں گی تم وہاں کسی میم سے شادی کر لو گے اور میں ساری عمر تمہیں یاد کرتی رہوں گی۔"

اختر نے کہا: "تو چلو! میرے ساتھ کیوں نہیں چلتی ہو۔"

سعیدہ نے کہا: "تم مجھے لے جاتے ہی کہاں ہو۔"

"چلو" اختر نے یقین دلاتے ہوئے کہا۔ "خدا کی قسم چلو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

"اسی طرح چلیں؟" سعیدہ نے پوچھا۔

"نہیں اسی طرح کیوں۔ تم اپنے سینڈل پہن لو۔" اختر نے جواب دیا۔

سعیدہ کی نمناک آنکھوں اور بھیگے ہوئے گالوں کے پیچھے دو پتلے پتلے ہونٹ مسکراہٹ سے پھیل گئے۔ "بتاؤں نا" سعیدہ نے اس کی چھاتی پر ہولے سے سر مارتے ہوئے کہا۔

"کیا؟" اختر نے پوچھا

"یہی"

"یہی کیا؟"

"بس یہی"

"اوہو۔ تم تو شاید شادی کے بارے میں کہہ رہی ہو —— کیوں ہے نا؟"

"ہاں"

"تو بھائی غرض یہ ہے کہ تمہارے والدین نہیں مانتے"

"جھوٹ" سعیدہ نے آنسو پونچھ کر کہا۔

"کیوں؟"

"تایا جان نہیں مانتے کہ میرے ابا جان۔"

"ایک ہی بات ہے۔ تمہارے ابا گیا اور ان کے بڑے بھائی گیا۔"

"لیکن تایا جان کو میں اتنی بری کیوں لگتی ہوں؟" سعیدہ نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"بری تو کوئی ایسی نہیں لگتی ہو" اختر نے جواب دیا "وہ صرف تمہیں ناپسند کرتے ہیں۔"

"تم تو مجھے پسند کرتے ہو نا اختر جی؟" سعیدہ نے بے چینی سے پوچھا۔

اختر نے اسے زور سے بھینچ لیا "کیسی باتیں کرتی ہو۔ ابا جان چاہے مانیں یا نہ لیکن میں تمہیں سے شادی کروں گا۔ تم ہی تو میری سعیدہ ہو۔ بتاؤ میری ہو نا؟"

سعیدہ نے جواب دینے کی کوشش کی لیکن اس کے حلق میں کوئی چیز اٹک گئی۔ اس کی آنکھوں سے پھر آنسو بہہ نکلے جس قدر اختر اسے چپ کرانے کی کوشش کرتا اسی قدر ان کی روانی میں تیزی پیدا ہو جاتی۔ اس کے کوٹ کا کالر بھیگ گیا۔ رومال تر ہو گیا۔ حتیٰ کہ ان کھاری چشموں نے اس کے ہونٹوں کو ٹھوڑی تک لتھیڑ دیا۔

گینگ وے اٹھا دیا گیا۔ جہاز نے ایک مرتبہ پھر بھیانک آواز نکالی۔ سارے مسافر ریلنگ کے پاس جمع ہو گئے۔ اور رومال ہلا ہلا کر ساحل کے لوگوں کو الوداع کہہ رہے تھے۔ چچا جان اور چچی دونوں بڑے مغموم نظر آ رہے تھے۔ سعیدہ نے گوگو کی انگلی تھام رکھی تھی۔ اور اس کا نقاب ہوا میں پھڑپھڑا رہا تھا۔ ٹگس نے آہستہ آہستہ جہاز دھکیلنا شروع کر دیا۔ سبزی مائل نیلی نیلی لہریں بناتا ہوا جہاز رینگنے لگا۔ اختر کو آج پہلی مرتبہ احساس ہوا جیسے کوئی اس کے کلیجے کو آہنی پنجوں میں پکڑ کر لٹک گیا ہو۔ اس نے سعیدہ کے پھڑپھڑاتے ہوئے سیاہ نقاب کو آبدیدہ نگاہوں سے دیکھا اور آہستہ سے ہاتھ لہرایا۔ برفیلے تودے کی طرح پھسلتے ہوئے جہاز پر اسے یوں دکھائی دیا جیسے سعیدہ لہروں پر اس کے ساتھ ساتھ چل رہی ہے۔ اور پکار پکار کر کہہ رہی ہے۔

"اتّر جی واپس آؤ گے نا۔ اتّر جی مجھے یاد رکھو گے نا؟ ——— تم شعبدہ بازوں کے دیس میں جا رہے ہو۔ کافروں کے ملک کو جا رہے ہو یہ لوگ سحر کئے بغیر مسحور کر لیتے ہیں۔ سفید چمڑی دکھا کر لوگوں پر کالا علم کر دیتے ہیں۔ بھول نہ جانا اتّر جی۔ تم مجھ سے وعدہ کر کے جا رہے ہو۔ مجھ سے اقرار کر کے جا رہے ہو۔ بولو! تم آؤ گے نا؟ بتاؤ! اتّر جی مجھے خط لکھتے رہو گے نا؟ مجھے ڈر لگ رہا ہے اتّر جی۔ تم شعبدہ بازوں کے دیس میں جا رہے ہو۔ عیاروں کے طلسمات میں جا رہے ہو۔ بولو! بولو!! اتّر جی تم بولتے کیوں نہیں؟"

ٹگس نے جہاز کو دھکیلنا چھوڑ دیا تھا اور اب وہ اپنے آپ

چل رہا تھا۔ اس کی رفتار میں ذرا سا فرق آ گیا تھا۔ سائرن زور زور سے بجنے لگا تھا۔ مسافر اپنے اپنے ٹھکانوں پر پہنچ گئے تھے۔ اور جہازی چھوٹے بڑے رسّے لے کر ادھر ادھر گھومنے لگے تھے۔ اختر نے لہروں پر بھاگنے والی لڑکی سے نگاہیں ہٹا کر دور ساحل کی طرف دیکھا۔ سعیدہ کا نقاب ہوا میں پھڑپھڑا کر الوداع کہہ رہا تھا۔ اس نے ریلنگ سے ہاتھ اٹھا کر کان کے پاس اسے ہلکی سی جنبش دی اور اپنے کیبن میں آ گیا۔

۲

اگلی صبح اختر کی آنکھ بڑی دیر سے کھلی۔ اس کے تینوں ہمراہی اپنے اپنے بستر سمیٹ کر باہر چلے گئے تھے۔ اور کیبن خالی پڑا تھا۔ بستر پہ الٹی پالتی مار کر اختر نے پورٹ ہول سے باہر جھانک کر دیکھا۔ نیلے سمندر پر چمکتے ہوئے سورج کی تیز دھوپ آنکھ مچولی کھیل رہی تھی۔ جہاز کی روانی سے اردگرد بہت سی لہریں پیدا ہو رہی تھیں جن کے آگے پیچھے دھوپ غوطے مار کر ابھرتی چلی آتی تھی۔ وہ رات گئے تک ایک ایک کر کے اپنے گھر والوں کو یاد کرتا رہا تھا۔ دھیرے دھیرے گھومتے ہوئے ایک چاک پر اس کی امی، ابا، بھائی، بہن، چچا، چچی اور سعیدہ چپ کھڑے تھے۔ چاک گھومتا رہا اور اس پر لپٹا ہوا ہر وجود آہستہ آہستہ بھٹکتی ہوئی روح کی طرح تحلیل ہونے لگا۔ آخر میں صرف سعیدہ رہ گئی۔ اختر دبے پاؤں اس کے کمرے میں داخل ہوا۔ میز پر چھوٹی سی موم بتی جل رہی تھی۔ اس کے آس پاس چند بے ترتیب کتابیں پڑی تھیں، اور ان کے بیچوں بیچ نیلے رنگ کا ایک پیڈ کھلا پڑا تھا۔ سفید بستر پہ سعیدہ

اوندھے منہ لیٹی تھی اور اس کے ریشمی بالوں کا تکیے پر ڈھیر لگا ہوا تھا اختر نے دونوں ہاتھوں سے اس کے جھولی بھر بالوں کو سمیٹا۔ پیچیس سا ایک بل دیا اور اس کے دونوں کندھوں پر بوجھ ڈال کر اپنا گال اس کے سر پہ پھیر رکھ دیا۔ سعیدہ بچوں کی طرح پھسک پھسک رو رہی تھی اور ساٹن کا براق تکیہ بھیگ کر ہلکا سا موتیا رنگ اختیار کر گیا تھا۔ اختر نے اس کے شانے ہلا کر کہا۔

"سعیدہ روتی کیوں ہو۔ میں لام پر تو نہیں جا رہا۔ چند مہینوں ہی کی بات ہے جلد لوٹ آؤں گا اور آئندہ سے ہم اکٹھے سفر کیا کریں گے۔" سعیدہ اسی طرح تکیے میں منہ چھپائے زور زور سے سسکیاں بھرنے لگی۔ اس کا سارا بدن ہلکورے لینے لگا اور تکیے کے رگ و ریشہ میں پانی دور دور تک سرایت کر گیا۔ اختر نے چمکار کر کہا۔

"دیکھو تم سے وعدہ جو کیا ہے کہ جلد آؤں گا اور ضرور آؤں گا پھر تم روتی کیوں ہو؟ —————— تمہاری جان کی قسم سعیدہ میں امتحان ختم ہوتے ہی آ جاؤں گا۔ ضرور آ جاؤں گا۔ خواہ میری راہ میں جہنم ہی کیوں نہ حائل ہو۔" سعیدہ کے کرب میں اضافہ ہو گیا۔ دردناک سسکیوں نے اس کا بدن جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ چاک تیزی سے گھومنے لگا اور سعیدہ کا وجود بھی اختر کی آنکھوں میں نیند کی طرح تحلیل ہو گیا۔ اور اب اختر سمندر میں غوطے مار کر ابھرتی ہوئی دھوپ کو دیکھ رہا تھا جو ہر غوطے کے بعد نکھرتی چلی جاتی تھی۔

غسل خانے میں جا کر اختر نے شیو بنائی کھاری پانی سے بھرے ٹب میں غوطہ لگایا اور کپڑے بدل کر سموکنگ روم میں آ گیا۔ ایک بوڑھا درج

پائپ سلگائے موٹی سی کتاب پڑھ رہا تھا اور اس کے ساتھ نیلی آنکھوں والی ایک دھان پان سی لڑکی استنبول کا چپٹا سگریٹ پی رہی تھی۔ اختر نے صوفے پر بیٹھ کر جیب سے بیڑی نکالی۔ لائیٹر کے چکر کو زور سے رگڑتے ہوئے اس نے معنی خیز نگاہوں سے لڑکی کو دیکھا اور بیڑی سلگا کر کھینچنے لگا۔

عمل خاں نے کمرے میں داخل ہو کر زور سے کہا "صبح تو آپ بڑی دیر سے اٹھا۔" بوڑھے ڈچ اور نیلی چشم لڑکی نے چونک کر عمل خاں کو دیکھا تو اختر نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"تشریف رکھئے۔ میں صبح دیر سے اٹھنے کا عادی ہوں۔"

"چائے وائے تو نہیں پیا ہوگا آپ نے؟" عمل خاں نے پوچھا۔

"نہیں۔" اختر نے راکھ جھاڑتے ہوئے کہا "میں چائے پابندی سے نہیں پیتا۔"

عمل خاں نے ہنس کر کہا "اچھا خوب اے۔ صبح صبح تو چھوٹے بچے کو بی چائے طلب ہوتا۔"

"ہوتا ہوگا۔" اختر نے بے پروائی سے کہا "مجھے تو کسی چیز کا بھی طلب نہیں ہوتا۔"

عمل خاں پھر ہنسا اور ذرا ذرا سے وقفوں کے بعد دیر تک ہنستا رہا۔ پھر وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔

"آپ ذرا میرے ساتھ آؤ۔ ایک ضروری کام ہے جس کو آپ کے بعد اور کوئی نہیں کر سکتا۔"

کیبن میں پہنچ کر عمل خاں نے اپنے بکس سے ایک رجسٹر نکالا اور اسے کھولے بغیر اختر کو اپنے بارے میں بتانے لگا کہ وہ کھالوں کا ایک بہت بڑا بیوپاری ہے اور سرحد کے علاقے سے جتنی کھالیں باٹا کمپنی خریدتی ہے وہ اسی کی معرفت خریدی جاتی ہیں۔ اور اب وہ کمپنی کا صدر دفتر دیکھنے کے لئے چیکوسلواکیہ جا رہا ہے۔ عمل خاں نے بتایا کہ یہ دعوت اسے کمپنی کی طرف سے دی گئی ہے اور اس کے ساتھ کمپنی کا ایک کارندہ مسٹر شمّو کا بھی جا رہا ہے جو رات اختر کے سامنے والی برتھ پر سویا تھا۔

"اور اب" عمل خاں نے کہا "اور اب بڑی مصیبت ہے۔ مجھکو انگریزی نئیں آتا۔ اور اُدر ولایت میں سب انگریزی بولے گا۔ پشتو کا فکر نئیں۔ اور کوئی اردو بولے تو ہم بی بولے۔" پھر اس نے رجسٹر کھول کر کہا "اسی لئے ہم نے یہ کاپی تیار کیا ہے۔"

اختر نے دیکھا کاپی کے دس بارہ صفحوں پر اردو میں مختلف قسم کے سوال لکھے ہوئے تھے۔ "آپ کا نام کیا ہے؟ آپ کی گھڑی میں کیا بجا ہے؟ یہ راستہ کدھر جاتا ہے؟ تم کہاں کے رہنے والے ہو؟ میں پٹھان ہوں۔ ہمارا وطن صوبۂ سرحد ہے۔ میں کھالوں کی تجارت کرتا ہوں۔ اول اول تو یہ سوال چھوٹے چھوٹے تھے لیکن آخری صفحات پر کوئی سوال بھی دس بارہ سطروں سے کم نہ تھا۔ عمل خاں نے کہا۔

"بس اتنا مہربانی آپ کرو کہ ان کے جواب انگریزی میں بنا کر اردو میں لکھ دو۔"

اختر نے کہا: "یہ کام دس بارہ دن سے کم کا نہیں۔ آپ خواہ مخواہ تکلف کرتے ہیں۔ جب تک میں ان کا ترجمہ کروں گا۔ جہاز جنوا پہنچ جائے گا۔"

عمل خاں نے کچھ سوچ کر کہا: "اچھا پر آپ ضروری سوالوں کا جواب لکھ دو۔"

اختر نے کاپی عمل خاں سے لے کر اولین سوالوں کے انگریزی جواب اردو رسم الخط میں لکھ دیئے۔ جب وہ کیبن سے نکلنے لگے تو مسٹر شمو کا اندر داخل ہوا۔ عمل خاں نے دونوں کا تعارف کرایا اور وہ دونوں اپنی شناسائی کو تقویت پہنچانے کے لئے ٹوپ ڈیک پر چلے گئے۔

دوپہر کے کھانے پر جب وہ سیلون میں داخل ہوئے تو شموکا نے آخری کونے کی طرف آنکھ سے اشارہ کرتے ہوئے اختر سے پوچھا: "اس لڑکی کو رات دیکھا تھا؟"

اختر نے بے پروائی سے کہا: "میں لڑکیوں کو غور سے دیکھنے کا عادی نہیں۔ چلتے پھرتے کوئی عین نگاہوں کے سامنے آجائے تو دیکھ لیتا ہوں ورنہ مجھ سے تردد نہیں ہوتا۔"

شموکا نے کہا: "تو تم بڑے ٹھنڈے آدمی ہو۔"

"بس کچھ ایسے ہی سمجھو۔" اختر نے اطمینان سے جواب دیا: "میں ایسے گاؤں میں پیدا ہوا تھا جہاں سارا سال برف پڑتی ہے۔"

کھانے کی میز پر مسٹر راؤ اپنی بیوی سے گھڑی گھڑی اس کی عافیت پوچھ رہے تھے۔ وہ دونوں اپنے اپریشن کروانے وائنا جا رہے تھے،

اور اختر کو بدقسمتی سے اسی جہاز میں جگہ ملی تھی جس میں وہ سوار تھے اور اسی کیبن میں برتھ نصیب ہوئی تھی جس میں یہ دائم المریض جوڑا سفر کر رہا تھا۔ اور اب ستم ظریفی یہ کہ اختر کو کھانے کی میز پر بھی انہی لوگوں کا ساتھ دینا پڑا۔ میز پر جتنی دفعہ مسٹر راؤ نے اپنی بیوی سے اس کی لحظہ بہ لحظہ بدلتی ہوئی طبیعت کے بارے میں پوچھا اتنی مرتبہ اختر نے گھور کر اسی لڑکی کی طرف دیکھا جس کی گردن کے پیچھے سُرخ سنہرا جُوڑا جھلکیاں مار رہا تھا اور میز سے اُٹھتے وقت جب مسٹر راؤ اپنی بیوی کی بیمار پرسی کرنا بھول گئے تو بھی اختر نے اس لڑکی کو غور سے دیکھ ہی لیا کیونکہ اسے علم تھا کہ اگر راؤ کا رومال فرش پہ نہ گر پڑتا اور وہ اسے نہیں اُٹھاتے تو وہ ضرور اپنی ڈارلنگ سے اس کا احوال پوچھتے۔

چودھویں رات کا چاند اپنا معصوم سا چہرہ لے کر مسکرا رہا تھا۔ سمندر کی لہریں اسے چھونے کے لئے بیتاب ہوئی جاتی تھیں۔ جہاز اپنی مخصوص آواز نکالتا آگے بڑھ رہا تھا۔ لہریں اس کی دیواروں سے سر ٹکرا کے بھاگ نکلتی تھیں۔ اختر آہستہ آہستہ سگریٹ پیتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ یورپین لڑکیوں کے بال اور آنکھیں ایسی بھی ہو سکتی ہیں؟ شموکا نے ڈھونڈتے ڈھونڈتے آخر اس کا کھوج نکال ہی لیا۔ اختر کے کندھے پر اس نے زور سے ہاتھ مار کر کہا: "یہاں کیا کر رہے ہو چلو چل کر ڈانس دیکھیں۔ وہاں وہ لڑکی بھی ہوگی۔ اسے غور سے نہ دیکھنا یونہی دیکھ کر چلے آنا۔"

جب وہ بی ڈیک پر ناچ کے کمرے میں داخل ہوئے تو وہی لڑکی ایک ادھیڑ عمر کے آدمی کے ساتھ ناچتی ہوئی دروازے کے قریب سے گزر رہی

تھی۔ اختر نے اسے بھرپور نگاہوں سے دیکھا اور اپنی نظریں اس پر گاڑ دیں۔ جیسے جیسے وہ گھومتی رہی اختر کی نگاہیں اس کے ساتھ ساتھ چکر لگاتی رہیں۔ اس نے ایک مرتبہ گھور کر اختر کو دیکھا اور پھر اپنی توجہ ادھر سے ہٹا لی۔ شموکا نے پوچھا۔

"آخر اسے یوں غور سے کیوں دیکھا جا رہا ہے؟"

اختر نے اپنی نگاہیں ہٹائے بغیر جواب دیا: "میں سوچ رہا ہوں بھلا اس چھوکری میں ہے کیا جو سارے لوگ اس میں ایسی دلچسپی لے رہے ہیں"۔ شموکا نے جواب دیا: "اس میں کیا نہیں۔ یہ سمندر کی نیلاہٹ، چاند کی چاندنی، موسیقی کی دھن، ماں کی ممتا اور جلاد کا کڑا پن، بھلا اس میں کیا نہیں"۔

اختر نے ہنسنے کی کوشش کی لیکن اس سے مسکرایا بھی نہ جا سکا اور وہ شموکا کو لے کر ٹوپ ڈیک پر آ گیا۔ سیڑھیوں کے قریب ہی دو چھوٹی چھوٹی کرسیاں پڑی تھیں جہاں وہ آرام سے بیٹھ کر سگریٹ پینے لگے۔ ان کے سروں کے پیچھے سفید سفید کشتیاں لٹک رہی تھیں اور ان کے سامنے موٹے موٹے رسوں کے ڈھیر پڑے تھے۔ دور دور تک جہاں پانی نظر آتا تھا چاند کی چاندنی اس سے لپٹی ہوئی تھی اور اونچی اونچی لہریں شور مچا مچا کر اپنے دامن جھٹک رہی تھیں۔

سیڑھیوں پر ہلکی سی آہٹ ہوئی اور چشم زدن میں وہ لڑکی ان کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی اس نے بڑی ملائمت سے کہا۔

"میں تھک گئی ہوں اور میرا سر چکرانے لگا ہے۔ اگر آپ برا نہ مانیں تو میں چند لمحوں کے لئے آپ کے پاس بیٹھ جاؤں"

دونوں نے اپنی اپنی کرسیاں پیش کیں لیکن وہ ادھر ادھر دیکھ کر کہنے لگی۔

"آپ تکلیف نہ کیجئے۔ رسوں کا یہ ڈھیر بھی کرسی سے کم نہیں"۔

اختر نے اس کے تاکے ہوئے ڈھیر پر بیٹھ کر کہا: "بہتر تو یہی تھا کہ آپ کرسی پر بیٹھیں لیکن خیر! آپ کی مرضی نہیں تو نہ سہی"۔

وہ ذرا سی مسکرائی اور اختر کی کرسی پر بیٹھ گئی۔ ایک لمبی جمائی لے کر اس نے پوچھا۔

"آپ لوگ کیا پئیں گے؟"

"لیمونیڈ"! اختر نے منہ پھاڑ کر جواب دیا۔

"گیملٹ نہیں؟"

"گیملٹ"! اختر نے ہنستے ہوئے کہا: "وہ کیا ہوتا ہے؟"

"ایک مشروب"

"شراب تو نہیں ہوتی؟" اختر نے پوچھا۔

"تھوڑی سی" اس نے چٹکی کھول کر کہا۔

"توبہ توبہ" اختر نے کان چھو کر کہا "ہمارے مذہب میں تو شراب کا نام لینا بھی حرام ہے آپ پینے کو کہہ رہی ہیں"

"تو تم نہ پینا" اس نے شموکا کی طرف دیکھ کر کہا "آپ کیا پئیں گے؟"

شموکا نے بڑے ادب سے کہا: "وہسکی"

اس نے شموکا پر ایک مسکراہٹ ڈال کر کہا: "بار خاطر نہ ہو تو ذرا بیرے کو بلا لائیے"

اور شمو کا بجلی کی طرح سیڑھیوں سے نیچے لپک گیا۔

طانگوں کی قینچی پر اس نے اپنی کہنی لگا کر ٹھوڑی ہتھیلی پر رکھتے ہوئے کہا۔

"تم کل سے مجھے گھور رہے ہو اور بات کرنے کے متمنی ہو۔ میں بھی اسی دن سے تمہیں دیکھ رہی ہوں پر میرے جی میں تم سے بات کرنے کی خواہش آج پیدا ہوئی ہے لیکن تم چونکہ بزدل تھے تمہیں جرأت نہ ہوئی اور میں اس لئے کہ بے باک ہوں تم سے باتیں کرنے چلی آئی۔"

اختر نے کہا: "آپ کو وہم ہو رہا ہے۔ میرے دل میں تو آپ سے بات کرنے کی تمنا کبھی بھی نہیں ہوئی۔"

اس نے مسکرا کر کہا: "یہ باتیں بمبئی کے ساحل تک ہی ٹھیک تھیں۔ اب تم عین سمندر میں ہو۔ یہاں تو اپنے آپ کو دھوکا دینے کی کوشش نہ کرو۔"

"دھوکا؟" اختر نے حیرانی سے کہا۔ "اور وہ بھی اپنے آپ کو۔ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔"

"خدا کی قسم میں ٹھیک کہتی ہوں۔" اس نے اردو میں جواب دیا۔

"تمہیں اردو آتی ہے؟" اختر نے اور حیران ہو کر پوچھا۔

"کچھ کچھ۔" اس نے پھر اسی طرح چٹکی کھولی۔

اتنے میں شمو کا بیرے کو ساتھ لے کر آ گیا۔ اس نے دو گملٹ اور ایک بوتل وہسکی کا آرڈر دیا تو اختر نے کہا۔

"میرا لیمونیڈ؟"

"تم لیمونیڈ نہیں پیو گے۔" اس نے چمکار کر کہا۔

جب بیرا گیا تو اس نے پھر اسی لجاجت سے شمو کا سے کہا: "میرا پرس نیچے ڈانس روم میں رہ گیا ہے......"

اور فقرہ ابھی مکمل بھی نہ ہوا تھا کہ شمو کا پھر سیڑھیوں میں غوطہ لگا گیا۔

اس نے کہا: "ہندوستان والی باتیں چھوڑ دو۔ اپنے گھر میں تم سب کی آنکھوں کے تارے تھے ٹھیک ہے! لیکن یہ عرشہ جہاز ہے اور تم یورپ جا رہے ہو۔"

اختر نے کہا: "میں تو تمہیں چھیڑ رہا تھا ورنہ گملٹ تو میں ہزار مرتبہ پی چکا ہوں۔"

"گملٹ۔" اس نے بڑے اطمینان سے کہا: "اپنی دانست میں تو شاید تم نے لاکھ مرتبہ پی ہو لیکن اس وقت تم اسے پہلی مرتبہ چکھو گے۔"

اختر خاموش ہو گیا تو اس نے کہا: "رسوں کے ڈھیر پر بیٹھے بیٹھے تھک گئے ہو گے۔ یہاں آ جاؤ۔ تمہارا ساتھی تمہاری جگہ بیٹھ جائے گا۔"

"نہیں میں بڑے مزے میں ہوں۔" اختر نے جواب دیا "آپ تردد نہ کریں۔"

"میری مانو۔" اس نے سنجیدگی سے کہا: "یہاں آ جاؤ تم تھک جاؤ گے اور رات بھر مجھے کوستے رہو گے۔"

اور جب شمو کا پرس لے کر واپس آیا تو اس کی جگہ پر اختر بیٹھا ہوا تھا بیرا آرڈر لے کر آ گیا۔ اختر اور وہ لڑکی چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھر کر گملٹ پینے لگے اور شمو کا وہسکی کے جرعے چڑھانے لگا۔ آدھی بوتل کے بعد اس کی حالت

خراب ہوگئی اس نے زور زور سے اپنے ملک کے لوک گیت گانے شروع کر دیئے۔ اس لڑکی نے شموکا کا کندھا تھپک کر کہا" نیچے جاکر سو رہو۔ تمہیں ٹھنڈ لگ جائے گی۔"

"ٹھنڈ" شموکا نے خوفزدہ ہوکر کہا" اف خدایا کتنی ٹھنڈ ہے! مجھے سردی لگ رہی ہے۔ میں تمہاری بوتل اپنے ساتھ لے جاؤں؟"

"شوق سے" اس نے مسکرا کر کہا "اچھا ہو تو ایک بوتل اور منگوا دوں"

"نہیں نہیں شکریہ، شکریہ!" کہتا شموکا لڑکھڑاتا ہوا سیڑھیوں سے نیچے اتر گیا۔ اور وہ رات گئے تک ریلنگ پر کہنیاں ٹیکے باتیں کرتے رہے اور لہروں کو تلملاتے ہوئے دیکھا کئے!

صبح صبح وہ لڑکی اختر کے کیبن میں آئی تو اختر نے عمل خاں سے اس کا تعارف کرایا۔ عمل خاں نے سرحدی ساخت کی انگریزی میں پوچھا" آپ کا نام کیا ہے؟"

"ایستھر" اس نے مسکرا کر کہا۔

"آپ کہاں کی رہنے والی ہیں؟" عمل خاں نے تھوڑی دیر بعد پوچھا۔

ایستھر نے کہا" میں جرمن ہوں اور میونک کی رہنے والی ہوں"

عمل خاں نے سوچ کر بڑی مشکل سے کہا" میں سرحد کا باشندہ ہوں اور کھالوں کا تاجر ہوں"

ایستھر نے پوچھا" آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

عمل خاں نے فوراً کہا" چیکوسلواکیہ"

ایستھر نے سوال کیا" آپ تجارت کے سلسلے میں چیکوسلواکیہ جا رہے ہیں یا سیاحت کی غرض سے گھر سے نکلے ہیں" چونکہ ایسے سوال کا جواب عمل خاں کے رجسٹر میں نہیں تھا اس لئے وہ پریشان ہوکر ٹکر ٹکر اختر کا منہ تکنے لگا۔

اختر نے مسکراتے ہوئے ایستھر سے کہا" تم نصاب سے باہر کا سوال پوچھ رہی ہو۔ یہ واجب نہیں۔ عمل خاں نے ابھی اپنا پہلا سبق بھی ٹھیک سے یاد نہیں کیا"

اس کی بات ایستھر کی سمجھ میں نہ آئی۔ اس نے مزید استفسار کیا تو اختر نے خان کے سمندری سفر پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ عمل خاں انگریزی سیکھ رہا ہے اور چند بندھے ٹکے سوالوں کے علاوہ اور کسی سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔ اس پر ایستھر کو ہنسی آگئی اور عمل خاں بھی بہروں کی طرح سر ہلاتا اس کی ہنسی میں شامل ہوگیا۔

جب انہوں نے سٹوارڈ کی مٹھی گرم کر کے کھانے کے کمرے میں ایک علیحدہ میز حاصل کر لی تو اختر نے کہا۔

"مجھے سمندر کے سفر میں ذرا بھی لطف نہیں آ رہا۔ ابھی تک نہ تو مجھے سمندری بیماری نے گھیرا ہے اور نہ ہی بحری قزاقوں نے جہاز پر حملہ کیا ہے"

ایستھر نے کہا" کمال ہے تم میں محسوس کرنے کا مادہ سرے سے مفقود ہے۔ بحری قزاق نے تم پر حملہ کیا، تم گھائل ہوگئے لیکن گرتے گرتے تم نے اسے بھی ہلاک کر دیا۔ حیران ہوں تمہیں اتنے بڑے حادثے کا ابھی تک

علم کیوں نہیں ہوا؟"

"اور سمندری روگ کیا ہوا۔ اختر نے مسکرا کر پوچھا۔

"سمندری روگ۔" ایستھر نے دہراتے ہوئے کہا "سمندری روگ تو تمہیں اس وقت لگے گا جب تم ساحل پر اتر کر گاڑی میں سوار ہو جاؤ گے۔"

اختر نے سیانوں کی طرح کہا "دیکھو ایستھر تم نے ڈاکٹریٹ تو نفسیات میں کی ہے اور باتیں خلیل جبرانی فلسفے میں کرتی ہو۔ یہ فلسفہ تمہارے منہ سے اوپرا اوپرا سا لگتا ہے۔"

ایستھر نے کہا "واقعی چھوٹوں کو بزرگوں کی ہر بات فلسفہ معلوم ہوتی ہے ——— عزیز من میری تو ہر بات سیدھی ہے۔ یہ تو تمہاری سعادتمندی ہے کہ تم اسے فلسفے سے منسوب کرتے ہو۔"

اختر جھینپ سا گیا اور اس نے بات کا رخ پلٹتے ہوئے پوچھا،

"بھلا ایستھر کے معنی کیا ہوئے؟"

ایستھر نے کہا "ایستھر ستارے کو کہتے ہیں جو ......"

"کمال حادثہ ہے۔" اختر نے بات کاٹ کر کہا "اختر کے معنی بھی ستارے کے ہوتے ہیں۔"

"حادثہ نہیں۔" ایستھر نے سنجیدگی سے کہا "یہ تو ہونے ہار حقیقتیں ہیں۔ ستاروں کی تجویزہ چالیں ہیں۔"

اختر نے بے چینی سے کہا "ہونے ہار حقیقتوں کو چھوڑو۔ مجھے یہ بتاؤ کہ تم ہندوستان کس غرض سے آئی تھیں؟"

ایستھر نے جواب دیا "یہ مجھے خود بھی معلوم نہیں۔"

"اردو سیکھنے آئی تھیں؟"

"اونہوں۔"

"کسی کی محبت کھینچ لائی؟"

"بالکل نہیں۔"

"کسی نفسیاتی مطالعے کے سلسلے میں زحمت کی؟"

"نہیں۔"

"تو پھر تم ادھر کیسے چلی آئیں؟"

ایستھر نے کہا "میرے ہاتھ پر سمندر کے سفر کی ریکھا تھی۔ اور جنوا سے جو تیار جہاز مجھے ملا وہ بمبئی آرہا تھا۔ میں ہندوستان چلی آئی ——— کیا میں نے برا کیا؟"

"ہرگز نہیں۔" اختر نے وثوق سے کہا "تم نے بہت ہی اچھا کیا۔"

ایستھر کا قد لمبا تھا۔ بال بالکل سیاہ اور بڑی بڑی آنکھوں میں موتی کوٹ کوٹ کر بھرے تھے۔ چلتی تو ایسے لگتا جیسے راج ہنس تیر رہا ہو۔ نہ پاؤں کی چاپ ہوتی نہ قدم تیزی سے اٹھتے ایک لہر ہوتی جو ساگر کی چھاتی پر ہولے سے ابھرتی اور ابھری چلی جاتی۔ دم رفتار کوئی چیز اسے ادھر ادھر دیکھنے پر مائل نہ کر سکتی۔ اس نے پیچھے مڑ کر کبھی نہ دیکھا تھا اور اگر کوئی اسے آواز دیتا تو وہ اپنی جگہ پر اسی طرح رک جاتی حتٰی کہ پکارنے والا اس کے پاس پہنچ کر سامنے کھڑا ہو جاتا۔ راستہ چلتے لوگوں کو ہیلو کہہ کر متوجہ کرنا اس کا شعار نہیں تھا وہ تو اپنے

قریب سے گزرنے والوں پر ایک ہلکی سی متبسم نگاہ ڈال کر سر کی خفیف سی جنبش
ے وش کیا کرتی تھی۔

میونک کے ایک امیر گھرانے سے تعلق رکھنے والی اس لڑکی نے تعلیمی
حلقوں میں بڑا نام پیدا کیا تھا۔ وہ جرمنی کی سب سے کم عمر پی۔ ایچ۔ ڈی تھی اور اپنی
مادری زبان کے علاوہ انگریزی اور فرانسیسی میں بھی دستگاہ رکھتی تھی۔ عمر خیام
کی رباعیات وہ فارسی رسم الخط میں اچھی طرح سے پڑھ سکتی تھی اور آسانی سے
ان کے مطالب بیان کر لیتی تھی۔ اور اب اس نے اردو میں بھی عمل تحاں کی طرح
ے سوال پوچھنے شروع کر دیئے تھے۔ ان دنوں ایستھر میونک یونیورسٹی میں خط
ینی پر ایک مقالہ لکھ رہی تھی اور یہ اس کی تکمیل کا آخری سال تھا۔ تصویر کشی اس
کا ایک ہی مشغلہ تھا اور وہ خالی اوقات میں جہاز پہ بھی خاکے بنا بنا کر اپنی فائل میں
ٹانکے جاتی تھی۔ ایک دن جب اختر نے اسے بتایا کہ وہ تقریباً سال بھر تک جوتے
فروخت کرتا رہا ہے تو اس نے لپ اسٹک سے اخبار پر بے شمار جوتوں کی اشکال
بنا کر اپنا خیال ظاہر کیا تھا کہ فراعنہ مصر اس قسم کے پاپوش پہنتے ہوں گے۔ جوتے
رانی وضع کے تھے اور ایک سے ایک کا انداز نہیں ملتا تھا۔

یہ پورٹ سعید پر پہنچنے سے ایک رات پہلے کا واقعہ ہے۔ اختر اور
ایستھر ٹاپ ڈیک پر رسوں کے ڈھیر کے پاس بیٹھے تھے۔ چاند ابھی طلوع نہیں ہوا
تھا۔ سطح آب آئینے کی طرح ہموار تھی اور جہاز اپنی منزل کی جانب ہولے ہولے
سرکتا جا رہا تھا۔ اختر نے کہا۔

"ایستھر! یوں لگتا ہے جیسے عرصے سے ہم ایک دوسرے کو جانتے

ہیں۔ اور ایک دوسرے کے دل کی گہرائیوں سے واقف ہیں"۔ اس نے ایستھر کا
ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا اور دھیمی آواز میں کہنا شروع کیا۔

"میرا جی چاہتا ہے کہ یہ سفر کبھی بھی ختم نہ ہو۔ یہ جہاز یوں ہی چلتا رہے
اور اچانک کسی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے یا اسے بحری قزاق لوٹ لیں اور
ہمیں حلقہ بگوش بنا کر عمر بھر کے لئے اپنی چاکری میں لے لیں۔ لیکن مجھے معلوم ہے
یوں نہ ہو سکے گا۔ آخر ایک دن یہ جہاز اپنی منزل پر پہنچ جائے گا تم میونک روانہ
ہو جاؤ گی اور مجھے لندن جانا پڑے گا ——— ایسے نہیں ہو سکتا ایستھر کہ میں بھی
تمہارے ساتھ میونک چلا چلوں"۔

ایستھر نے اپنا ہاتھ کھینچ کر کہا۔ "نہیں! میں نہیں چاہتی کہ تم سکول سے
بھاگ جانے والے بچوں کی طرح میرے ساتھ میونک چلے آؤ اور اپنی زندگی کھلونے
بنانے والے کاریگر کی طرح گزار دو۔ میری تمنا ہے کہ تم اپنے امتحان میں شاندار کامیابی
حاصل کرو۔ میں تمہیں مبارکباد کا تار بھیجوں اور تم اپنے وطن واپس پہنچ کر مجھے اس
طرح بھلا دو۔ جیسے اپنی زندگی میں تم نے اور بہت سی لڑکیوں کو بھلا دیا ہے"۔ اس
نے اختر کے قریب سرکتے ہوئے کہا۔

"مجھے اپنی زندگی میں کبھی بھی ڈر محسوس نہیں ہوا لیکن اس وقت میں اپنے
آپ کو خوفزدہ اور پریشان سی پا رہی ہوں۔ مجھے ایسے لگ رہا ہے کہ تم میری کمزوری
ہوتے جا رہے ہو اور میں نہیں چاہتی کہ ایک آدمی میری کمزوری بن جائے۔ ایک اجنبی کی
خاطر میرے اصول اپاہج ہو کر رہ جائیں اور میری انفرادیت ایک ناواقف کے
سامنے چکنا چور ہو جائے۔ میں نہ تمہیں اپنے ساتھ میونک لے جاؤں گی اور نہ ہی

وہاں سے بلوا بھیجوں گی اور اگر فرض کر و میں تمہیں وہاں سے بلوا بھیج بھی دوں تو تم ہرگز نہ آنا ——— بولو میرے ساتھ وعدہ کرتے ہو؟"

اختر نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا اور نفی میں سر ہلا کر کہا "مجھے یہ وعدہ منظور نہیں۔ لیکن تمہیں اتنا یقین دلاتا ہوں کہ اگر تم نے مجھے نہ بلایا تو میں ہرگز نہ آؤں گا نہ ہی تمہیں خط لکھوں گا اور نہ ہی آئندہ کبھی ملنے کی کوشش کروں گا"

ایستھر نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا "ہندوستان جانیوالے جہاز میں داخل ہوتے وقت میرے قدم ڈگمگاتے تھے۔ میری روح لرزتی تھی اور میں کچھ سہم سی گئی تھی۔ میری تمہاری ملاقات حادثہ نہیں۔ یہ ستاروں کے کھیل ہیں اور میں تقدیر کی بڑی معتقد ہوں۔"

اختر نے ایستھر کو بازوؤں میں لے کر اس کی سیاہ آنکھوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے اور ایستھر رک رک کر پوچھنے لگی "اختر تم مروگے تو نہیں؟ تم زندہ رہوگے نا اختر ——— ہاں تم زندہ ہی رہوگے۔ تمہیں کوئی مار نہ سکے گا۔ تمہاری ٹوٹی ہوئی لائف لائن بھی تمہارا کچھ نہ بگاڑ سکے گی۔ تم زندہ رہوگے اور اپنے وطن پہنچ جاؤگے۔ وائیلڈ لینڈ چلے جاؤگے ——— تم مرنا مت اختر اور اگر کوئی تمہیں مارنا بھی چاہے تو بھی مت مرنا۔ مجھے زندگی بڑی اچھی لگتی ہے مجھے زندگی سے بڑا پیار ہے۔"

اختر نے اس کے فراخ ماتھے اور ابریشمی بالوں کو چومتے ہوئے کہا۔ "کیسی باتیں کرتی ہو۔ ایسے موقع پر یوں کہا کرتے ہیں کیا؟"

اگلی صبح جب اختر اس کے کیبن میں داخل ہوا تو وہ برتھ پر اوندھے

منہ لیٹی ہوئی تھی۔ اختر کے قدم اندر رکھتے ہی وہ آنکھیں ملتی اٹھ بیٹھی اور اسے دیکھے بغیر بولی "اختر!"

اختر نے پوچھا "تم نے مجھے دیکھے بغیر کیسے اندازہ لگا لیا کہ کیبن میں میں ہی داخل ہوا ہوں؟"

ایستھر نے کہا "پتہ نہیں۔ ایک نامعلوم حس مجھے فوراً بتا دیتی ہے کہ کمرے میں کون داخل ہوا ہے اور جوں ہی کوئی کمرے میں داخل ہوتا ہے میری آنکھ فوراً کھل جاتی ہے۔"

اختر نے کہا "ایسی اولیائی کی باتیں کبھی ہم بھی کیا کرتے تھے لیکن اب سیانے ہو گئے ہیں اور ایسے دعوے ترک کر دیئے ہیں۔"

"دعوے نہیں" ایستھر نے مسکرا کر کہا "یہ حقیقت ہے کبھی آزما دیکھنا"

اختر نے کہا "ایسی باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی۔ چلو تھوڑی دیر سموکنگ روم میں چل کر بیٹھیں۔"

ایستھر نے اس بات کا جواب دیئے بغیر اختر کا ہاتھ تھام کر کہا "میں تمہارا تھوڑا سا خون چکھ سکتی ہوں؟"

"تھوڑا سا!" اختر نے ہنس کر جواب دیا "تم چاہے میرا سارا خون پی لو"

ایستھر نے اس کی کلائی پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے اور جب اختر اپنے پتلون کی بائیں جیب سے سگریٹ کی ڈبیا نکالنے لگا تو اس نے اختر کی جلد کو زور سے کاٹ کھایا۔ خون کی ایک سست رو دھار جلد پہ پھیلی اور ایستھر نے اس لکیر کو اپنی کھردری زبان سے چاٹ کر کہا "بالکل میرے خون کا مزہ ہے۔

ویسی ہی خوشبو ہے۔ وہی رنگ ہے۔"

اختر نے زخم دیکھتے ہوئے کہا: "میں تو سمجھا تھا تم مذاق کر رہی ہو۔ لیکن تم نے تو سچ مچ کاٹ کھایا۔ یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟"

ایستھر نے اٹھ کر اپنا بیگ کھولا اور اس میں سے پٹی اور دوائی کی شیشی نکالتے ہوئے کہا: "مجھے تو کچھ نہیں ہوا۔ تمہیں ہی کچھ ہو گیا ہے۔ آخر تم اس جہاز پر سوار ہی کیوں ہوئے؟" پھر اس نے اختر کی کلائی کے گرد آہستہ آہستہ پٹی لپیٹتے ہوئے کہا: "تمہارا خون بالکل میرے جیسا ہے اور یہ بڑی خطرناک بات ہے نہایت ہی خطرناک بات —— جس طرح اب میں محسوس کر رہی ہوں کہ مجھے اپنے وطن سے باہر نکلنا نہیں چاہیے تھا تمہیں بھی آہستہ آہستہ احساس ہونے لگے گا کہ ہندوستان چھوڑ کر تم نے غلطی کی۔ ہم جیسے انسانوں کو سمندر کا سفر راس نہیں آتا —— مجھے تو اس نے تکلیف میں ڈال ہی دیا ہے۔ تم بھی عنقریب کرب میں مبتلا ہو جاؤ گے۔"

اختر نے تنگ آ کر کہا: "خدا کے لئے یہ نجومیوں والی کتھا چھوڑو۔ ایسی باتیں سن کر میری طبیعت مالش کرنے لگتی ہے۔ چلو باہر چل کر سمندر کا نظارہ کریں۔"

جب وہ کیبن سے باہر نکلے تو عمل خاں نے بڑے مغربی انداز میں گڈ مارننگ کہا اور اپنے لہجے کو سنوارتے ہوئے ایستھر سے پوچھا: "وہاٹ از دا ٹائم بائی یور واچ؟"

ایستھر نے ٹائم بتایا تو عمل خاں نے اپنی گھڑی پر نگاہ ڈال کر ذرا سا مسکرایا۔ جھک کر رکوع میں چلا گیا اور تھینک یو کہہ کر آگے چل دیا۔

کونٹی راسو پورٹ سعید پر قیام کرنے کے بعد روانہ ہو چکا تھا اور اب پھر اسی طرح ڈولتا ہوا جنوا کی جانب بڑھ رہا تھا۔ پورٹ سعید پر اختر اور ایستھر نے کسی مقام کی سیر نہیں کی۔ وہ سارا دن بندرگاہ پر ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے بلا مقصد ادھر ادھر گھومتے رہے۔ اپنے گھر والوں کو چٹھیاں لکھیں۔ ساحل کے کنارے رنگ برنگی چھتریوں کے نیچے بیٹھ کر چائے پی اور شام کو سمندر کی چڑھتی —— اترتی لہروں کے بیچ کھڑے ہو کر بیئر پیتے اور خالی بوتلیں دور دور تک سمندر میں پھینکتے رہے اور اب وہ اسی جہاز میں اپنے ہمراہیوں کے ساتھ اسی سمندر پر آگے بڑھ رہے تھے اور انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا کہ پورٹ سعید کبھی ان کی راہ میں آئی ہی نہ تھی۔

شموکا نے انہیں ایک دوسرے کے ساتھ بے تکلفی سے پیش آتے دیکھ کر اختر سے بول چال ترک کر دی تھی۔ مسٹر راؤ اور ان کی بیوی دونوں کو مشکوک نگاہوں سے دیکھنے لگے تھے۔ اور جب کبھی ایستھر اختر سے ملنے ان کے کیبن میں آتی تو وہ سیدھے منہ اس سے بات بھی نہ کرتے۔

اس رات جب ڈانس ختم ہوئے ایک گھنٹہ بیت گیا، مسافر اپنے اپنے بستروں میں دبک کر سو گئے اور باورچی خانے سے برتنوں کے بجنے کی آوازیں آنی بند ہو گئیں تو اختر یہ جانتے ہوئے بھی کہ رات کے وقت کسی خاتون کے کیبن میں جانا جہازی قواعد کی خلاف ورزی ہے دبے پاؤں ایستھر کے کیبن پر چلا گیا۔ اس نے دروازے کو انگلی سے بجائے بغیر آہستہ سے دھکیلا۔ پٹ کھل گیا اور ایستھر شب خوابی کے لباس میں آنکھیں ملتی

ہوئی اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے اختر کا نام لے کر ہولے سے سرگوشی کی اور اپنے
بازو آگے پھیلا دیئے۔ اختر اس کے ساتھ برتھ پر بیٹھ گیا اور اس کا سر اپنے
سینے سے لگا کر تھپکنے لگا۔ ایستھر اس کی گود میں سمٹ کر ہولے ہولے کراہ
رہی تھی: "تم یہاں کیوں چلے آئے اختر۔ تمہیں معلوم نہیں کہ رات کو کسی عورت
کے کیبن میں نہیں جاتے۔ اگر کپتان کو پتہ چل گیا تو آفت آ جائے گی تم سے
باز پرس ہوگی۔ سارے جہاز پر تشہیر ہو جائے گی اور میں مر جاؤں گی تم کیوں
آئے اختر! بتاؤ نا اس وقت کیوں آ گئے؟"

اختر نے اس کے کان کی لو کو ہونٹوں میں پکڑ رکھا تھا۔ ایستھر کی
باتوں کا جواب دینے کی بجائے اس نے ہونٹوں پر دانتوں کا دباؤ دے کر بناگوش
کو زور سے دبا دیا۔

ایستھر نے کہا: "جاؤ اختر، خدا کے لئے چلے جاؤ۔ میرے ذہن میں
قدموں کی صدائیں گونج رہی ہیں۔ مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے دروازے کے
قریب سے گھڑ سوار دستے گذر رہے ہیں۔ اور وہ تمہیں اپنے ٹاپوں کے نیچے
کچل دیں گے۔ وہ تمہیں مار دیں گے اور تمہاری روح میونک کے باغوں میں
بھٹکتی رہے گی۔ تم ہر چوراہے پر ہر موڑ پر میرا پیچھا کرتے رہو گے۔ مجھے ڈراتے
رہو گے۔ میں بھاگنے کی کوشش کروں گی اور مجھ سے بھاگا نہ جائے گا۔ میں مرنا
چاہوں گی اور مجھے موت نہ آئے گی۔ وہ دیکھو!" ایستھر نے تڑپ کر علیحدہ ہوتے
ہوئے کہا: "کسی نے دستک دی ہے۔ اب وہ لوگ تمہیں پکڑ کر لے جائیں گے
اور سامان اٹھانے والے جال میں لپیٹ کر سمندر میں پھینک دیں گے۔" اختر

نے اس کی باتوں کا جواب دینا مناسب نہ سمجھا اور اسی طرح اس کا سر تھپکتا رہا۔
وصل کے دن لمحوں کی صورت میں اڑتے رہے۔ نیپلز آیا اور گذر گیا
جہاز نے دن بھر یہاں قیام کیا اور پھر جنووا کی جانب چل پڑا۔ جوں جوں منزل قریب
آ رہی تھی اختر خاموش ہوتا جا رہا تھا۔ وہ گھنٹوں ریلنگ کا سہارا لئے کر سمندر کا
نظارہ کرتا رہتا۔ ایستھر اس کے پاس کرسی ڈال کر گود میں کتاب رکھے اس کا
منہ تکتی رہتی اور ان کے قریب سے گذرنے والے مسافر ان دونوں کو بڑے
غور سے دیکھا کرتے۔ ایستھر نے کبھی بھی اختر کو اپنی طرف متوجہ نہ کیا۔ وہ اسے
ہر حال میں دیکھ کر خوش تھی۔ اور اس کو کسی صورت میں بھی اپنے ڈھب پر لانے
کی متمنی نہ تھی۔ اگر وہ چپ ہوتا تو اسے اس کی خاموشی اچھی لگتی اور اگر وہ باتیں کرنے
کی ترنگ میں ہوتا تو ایستھر اسے بلا ٹوکے سب کچھ کہہ گذرنے دیتی۔ منزل سے
قربت کا احساس اور ایک دوسرے سے بچھڑ جانے کا غم دونوں کو کھائے
جاتا تھا۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے لگے
تھے کچھ کہے بغیر کسی کی سنے بنا اور ایک دوسرے کو دیکھے بغیر دونوں دل ہی
دل میں اس خاموشی کا مطلب اچھی طرح سے سمجھتے تھے۔ دونوں اپنے اپنے
دل کے ساتھ دوسرے کی واردات سے بھی اچھی طرح آگاہ تھے اور انہوں نے
بات کرنے کی کوشش شاید اس لئے ترک کر دی تھی کہ الفاظ ان کی کیفیات کو
اس حسن اور خوبی سے ادا نہ کر سکیں گے جیسے کہ خاموشی کر رہی تھی۔ اگر ان کے
درمیان کوئی بات ہوتی بھی تو وہ یا تو موسم کے بارے میں ہوتی یا دو کھی پھیکی سیاسیات
کے بارے میں۔ اور ایسی باتیں کرتے ہوئے انہیں ایک دوسرے کے دل کا

اچھی طرح علم ہوتا کہ دراصل وہ کوئی اور بات کہنی چاہتا ہے۔

صبح سات بجے کونٹی راسو جنووا پہنچ گیا۔ اختر کی گاڑی ساڑھے گیارہ بجے پیرس کے لئے روانہ ہوتی تھی اور ایستھر کو شام کے تین بجے سوار ہونا تھا جنووا میں اس مختصر سے قیام کے لئے انہیں سیوائے میں ایک کمرہ مل گیا۔ دونوں کا سامان ان کی ایجنسیوں کی معرفت سٹیشن پر پہنچ گیا تھا اور اب وہ اپنے کمرے میں اسی طرح چپ چاپ بیٹھے تھے۔ انہوں نے ایک ساتھ چائے پی، وقت گزارنے کے لئے اپنے اپنے بیگ الٹ کر انہیں صاف کیا، دیر تک قرینے سے ان میں چیزیں رکھتے رہے اور پھر اپنی اپنی جگہ پر اسی طرح خاموشی سے بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد ایستھر اٹھ کر کھڑکی سے باہر جھانکنے لگی۔ اور اختر نے اس کی کھلی ہوئی کتاب کو اپنی گود میں ڈال لیا۔ اس نے ایک آدھ سطر پڑھنے کی کوشش بھی کی، لیکن مردہ چیونٹیوں ایسے حروف اس سے اٹھ نہ سکے۔ اور وہ یونہی ورق الٹنے لگا۔ اس میں چند بے معنی خاکے سے تھے۔ لمبی لمبی رقموں والی جدولیں تھیں اور ہر باب کے آخر میں ٹیڑھے حروف کا ایک مختصر سا گوشوارہ تھا۔ ایستھر نے اوراق پلٹنے کی صدا سن کر پیچھے مڑ کر دیکھا اور آہستہ سے کھنکار کر کہا: "تم نے میرا صفحہ گم کر دیا!"

"ہاں" اختر نے دیکھے بغیر کہا اور کتاب بند کر کے میز پر رکھ دی۔ ایستھر ہولے ہولے قدم اٹھاتی پھر اپنی کرسی پر آکر بیٹھ گئی اور کتاب اٹھا کر صفحہ تلاش کرنے لگی۔

جب ویٹر نے اندر داخل ہو کر اختر کو بتایا کہ اس کی ٹیکسی آ گئی ہے

تو وہ اسے جواب دیئے بغیر جماہی لینے کی کوشش کرتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ بیگ سے اپنا پاسپورٹ نکال کر اس نے کوٹ کی جیب میں ڈالا اور بیگ کو تالہ لگاتے ہوئے اس نے کنکھیوں سے ایستھر کی طرف دیکھا جو ذرا سی آہٹ کئے بنا اپنی جگہ پر اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اختر کو اپنی طرف اس طرح دیکھتے ہوئے پا کر وہ دوڑ کر اس سے چمٹ گئی اور کہنے لگی۔

"میں تمہیں الوداع کہنے سٹیشن نہیں جا رہی ہوں۔ مجھے معلوم ہے یہ انتہائی بدتہذیبی ہے۔ لیکن میں تمہیں گاڑی میں کسی اور سمت جاتے دیکھنا برداشت نہیں کر سکتی۔ مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں مجھ سے وہاں ایسی حرکت سرزد نہ ہو جائے جس کے لئے بعد میں تمہیں پچھتانا پڑے —— بولو! مجھ سے ناراض تو نہیں ہو؟"

"ناراض!" اختر نے مسکرانے کی کوشش کی۔ "میں تم سے کبھی بھی ناراض نہیں ہو سکتا۔ مجھے اپنے اور تمہارے درمیان ناراضگی کا تصور ہی نہیں ہوتا۔ لیکن تم ایسی باتیں کیوں کر رہی ہو۔ بتاؤ مجھے خط لکھا کرو گی نا؟"

"ضرور لکھوں گی" ایستھر نے ضرور پر زور دے کر کہا۔ "جب تک تم لندن میں رہو گے میں تمہیں اکثر لکھتی رہوں گی۔"

"اور جب میں ہندوستان چلا جاؤں گا تو؟" اختر نے بات کاٹ کر پوچھا۔

"پھر نہیں" ایستھر نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ہرگز نہیں —— پھر تو میں تمہارا کسی سے ذکر بھی نہ کروں گی۔"

"وہ کیوں؟" اختر نے پوچھا۔

ایستھر نے کہا۔ "مجھے اس کی وجہ معلوم نہیں اور شاید میں عمر بھر اس کا سبب معلوم نہ کر سکوں۔"

اختر نے اسے الوداعی بوسہ دیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ ایستھر پھر دریچے کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ جوں ہی پرانی وضع کی ٹیکسی گیئر بدلتی اس دریچے کے نیچے سے گزری تو اختر نے اپنی سیٹ پر جھک کر اوپر کھڑکی کی طرف دیکھا اور ہاتھ لہرایا۔ ایستھر نے کوئی جواب نہ دیا اور جب ٹیکسی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تو اس نے سفید ڈوری کھینچ کر سبز جھلملیوں کو بند کر دیا اور پلنگ پر گر گئی۔

۳

دو تین دن وائی۔ ایم۔ سی۔ اے میں گزارنے کے بعد اختر کو آئی۔ ایس۔ یو ہوسٹل میں کمرہ مل گیا۔ یہ شام اختر کے لئے بڑی کٹھن تھی۔ اسے سعیدہ کی بھولی بھالی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ اس کے موتیوں جیسے آنسوؤں کا تانتا دکھائی دے رہا تھا۔ اور وہ کچھ کہے بنا اختر کے بازو سے لگی سسکیاں بھر رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایستھر کا چہرہ اختر کی نگاہوں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ وہ بے حد مغموم تھی لیکن اس کی آنکھوں سے ایک آنسو بھی نہ بہہ سکا تھا۔ اس کی آنکھوں کے پیچھے گہری جھیلیں ساگر کی طرح بھری ہوئی تھیں لیکن وہ ضبط کئے بیٹھی تھی۔ اور اس کا یہی ضبط اختر کو مارے ڈالتا تھا۔

سانس لیتے ہوئے اختر کو یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ ارادی طور پر ہوا اندر باہر کھینچ رہا ہے اور اس کے جسم کے اندر کچھ بھی نہیں۔ خالی ڈھول کی طرح اس کا پنجر اندر سے بالکل کھوکھلا ہو رہا تھا۔ ایک آدھ مرتبہ کھانس کر اس نے اپنے ڈھانچے کو چھوٹے چھوٹے جھٹکے دیئے۔ لیکن اسے اپنے ٹھوس ہونے

کا یقین نہ آیا۔ اس کا کوئی خاص عضو درد میں مبتلا نہیں تھا۔ اس پر بھی اسے بڑی تکلیف ہو رہی تھی اور وہ بغیر آواز نکالے کراہ رہا تھا۔ سوئیاں بٹنے والی مشین کی لٹھ اندر ہی اندر بل کھا رہی تھی۔ اور اختر کی جان نکلی جاتی تھی۔ اس نے ٹوپی اٹھائی اور کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ گوج سٹریٹ سے ٹیوب میں سوار ہوتے وقت اس نے سوچا کہ چلو سٹرینڈ چل کر ضروری اشیاء خریدتے ہیں۔ اور واپسی پر گیرک ہوٹل میں تلخ اوقات کو بتانے کی کوشش کرتے ہیں۔ سٹرینڈ پہنچ کر اس نے کسی دوکان میں داخل ہونے کی بجائے بڑے بڑے شوکیس اور رنگ برنگے پوسٹروں کو دیکھنا شروع کر دیا۔ ہر شوکیس میں بیسیوں چیزیں ایسی دکھائی دیتیں جنہیں اختر نے اس سے پہلے کہیں نہ دیکھا تھا اور جن کے استعمال سے وہ قطعی بیگانہ تھا۔ سڑکوں پر بسوں اور ٹیکسیوں کے ہارن [illegible] رہے تھے۔ اور وہ ایک دوسرے کے پیچھے دیوانے کتوں کی طرح دوڑ رہی تھیں۔ پورٹر بھاری بھاری بکس اٹھائے دوکانوں کے اندر آجا رہے تھے اور دور دور تک سارا ہجوم طلسماتی پتلیوں کی طرح حرکت کر رہا تھا۔ اختر کھسیانے بچے کی طرح نیلی پیلی تصویروں والے اشتہار دیکھ رہا تھا۔ لیکن اس کی ساری توجہ اس گہما گہمی پر مرکوز تھی جس سے اس نے اپنی نگاہیں جان بوجھ کر پھیر رکھی تھیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ہر تیز رو اس کے کندھے سے کندھا بھڑا کر معاف کیجئے گا کہتا ہوا آگے نکل جاتا۔ اختر نے ایک دوکان کے دروازے کے پاس کھڑے ہو کر غور سے ان سب لوگوں کا جائزہ لیا جو آگ بجھانے کی مہم پر جاتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ اسے اپنے

دیس کی بارونق انار کلی یاد آگئی۔ جہاں لوگ ایک دوسرے سے باتیں کرتے دوکا
میں جھانکتے اور سلام دعا کہتے بڑے آرام سے ہنستے کھیلتے گزر جاتے ہیں او
کسی کو نہیں کھلتا۔ اسے یہ نہ ختم ہونے والا ہجوم لوگوں کے اٹوٹ گروہ اور موٹروں کا لامتناہی سلسلہ ذرا بھی اچھا نہ لگا۔ اور وہ گھبرا کر ایک دوکان میں داخل ہو گیا۔ یو
تو سب چیزوں کے انتخاب میں اسے کافی دقت کا سامنا کرنا پڑا لیکن پیڈ منتخب کرتے وقت تو اس نے حد ہی کر دی۔ موجودہ طرز کے پیڈوں پر نگاہ ڈالے بغیر اس نے سیلز مین کو بتایا کہ وہ پرانی وضع کا پیڈ نسبتاً زیادہ پسند کرتا ہے۔ جس سے لائبریری کی سی بو آیا کرتی ہے۔ اور جس کا کاغذ خستہ تو نہیں ہوتا لیکن رنگ سے یوں ظاہر ہوتا ہے کہ بہت پرانا اور گراں ہے۔ سیلز مین نے اسے پرانی قسم کے بہت سے پیڈ دکھائے لیکن ان میں سے ایک بھی اسے پسند نہ آیا۔ دراصل وہ ایستھر کو خط میجی کی ریسرچ کی نسبت سے بھوج پتر پر خط لکھنا چاہتا تھا۔ او
بھوج پتر کی اس کو انگریزی نہیں آتی تھی ——— پیڈ خریدے بنا جب وہ اپنی چیزوں کا پیکٹ بغل میں داب کر باہر نکلا تو اندھیرا چھا چکا تھا اور گیس کی روشنی کے گرد دھند کی شبنمی چادریں لہرا رہی تھیں۔ قریبی ریستوران میں جا کر اس نے کافی کا آرڈر دیا اور پیکٹ کی ڈوری لپیٹتے کھولتے ہوئے خط کا مضمون سوچنے لگا۔ اور جب خط کا آخری فقرہ بھی اس کے ذہن میں تشکیل پا گیا تو اس نے دستخط کر کے کافی کا ایک گھونٹ بھرا اور اس کے سارے جسم میں برقاب کی ایک لہر دوڑ گئی۔ ویٹر کو نئے سرے سے آرڈر دے کر اختر نے اپنے دستخطوں کے نیچے پی۔ ایس کا سہارا لے کر پھر پیروں کے پیرے ڈھالنے شروع کر دیئے۔

اس خطوط نویسی اور کافی نوشی نے اتنا وقت لیا کہ گیرک میں دوسرے شو کا پہلا سین بھی ختم ہو گیا۔

کمرے میں پہنچ کر اختر ابھی پیکٹ کھول ہی رہا تھا کہ اس کے پڑوسی نے دھیمے سروں میں ع نالہ جز حسن طلب اے ستم ایجاد نہیں۔ گانا شروع کر دیا۔ پیکٹ کی ڈوری کھلتے کھلتے وہیں رہ گئی اور اختر اپنی کرسی میں دراز ہو گیا جب وہ قافیے پر پہنچتا تو لے میں ایسی مرکیاں ڈالتا کہ شعر نئے نئے مطالب بیان کرنے لگتا۔ اور ع دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں تو اس نے اتنی مرتبہ گایا کہ سجا سجایا کمرہ ویران ہو گیا۔ جھکڑ چلنے لگے اور خزاں رسیدہ درختوں کی ننگی شاخیں سیٹیاں سی بجانے لگیں۔ وہ گا رہا تھا اور اختر کرسی کے بازوؤں کو مضبوطی سے پکڑے ڈھنڈار آنکھیں کھولے اس کی تانیں سن رہا تھا اور اس کا سگریٹ راکھ دان میں سلگ سلگ کر ختم ہو چکا تھا۔ مقطع پر پہنچ کر گانے والا قریباً کراہنے لگا اور درد کی شدت کو تلخی سے دبا کر اپنی دھن میں گائے جاتا تھا ؎

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب
تم کو بے مہریٔ یاران وطن یاد نہیں

اس نے گاتے گاتے "یاد نہیں" کو ایک بار تحت اللفظ میں ادا کر کے اختر کو تڑپا دیا۔ اور وہ چپکے سے اٹھ کر اس کے دروازے پر پہنچ گیا۔ گیت ختم ہو رہا تھا شروع کے بول ڈولے جا رہے تھے اور گانے والے نے گنگنانا شروع کر دیا تھا۔ اختر نے دروازے کو انگلی سے بجایا: "چلے آؤ"۔ اندر سے آواز

آئی اور اختر دروازہ کھول کر مسکراتا ہوا اندر آ گیا۔ ایک ثانیے کے لئے دونوں خاموش رہے۔ ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر اختر نے کہا۔

"میرا نام اختر ہے۔ لاہور سے آیا ہوں اور آپ کا پڑوسی ہوں"

"میرا نام شفیع ہے" اس نے پنجابی میں جواب دیا "اور میں راولپنڈی کا رہنے والا ہوں"

"تو آپ راجہ شفیع ہیں" اختر نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا "پنڈی کا تو ہر شخص راجہ ہوتا ہے"

"جی" شفیع نے سنجیدگی سے کہا "لیکن آپ کب تشریف لائے اور کب سے میرے پڑوسی ہیں؟"

اختر نے کہا "مجھے لندن آئے آج چوتھا دن ہے اور ہوسٹل میں آج شام ہی کو پہنچا ہوں"

شفیع نے کہا "آپ کے کمرے میں پہلے ایک مدراسی رہتا تھا میری اس سے معمولی علیک سلیک تھی چونکہ وہ ہر وقت کتابوں میں کھویا رہتا تھا اس لئے میں نے اسے کبھی زحمت نہیں دی تھی۔ اچھا ہی ہوا کہ آپ آ گئے"

اختر نے ہنس کر کہا "آپ کو یہ اندازہ کیسے ہوا کہ میں کتابی کیڑا نہیں ہوں"

"یہ تو آپ کے بشرے سے ظاہر ہے" شفیع نے اسے سگریٹ پیش کرتے ہوئے کہا "آدمی چہرے مہرے سے جھٹ پہچانا جاتا ہے"

اختر نے کہا "میں آپ کو اپنے سرٹیفکیٹ دکھا کر یقین دلا سکتا ہوں کہ میں نے اپنی عمر ایک محنتی طالب علم کی طرح گزاری ہے اور اب یہاں بھی اسی غرض

سے آیا ہوں۔"

"میں بھی اسی غرض سے یہاں آیا تھا۔" شفیع نے ایک لمبا کش لیا "لیکن
لندن کی زندگی آدمی کو سست بنا دیتی ہے۔ اور اب میں خدا کے فضل سے
اچھے خاصے کاہل طالب علموں میں شمار ہوتا ہوں۔"

اختر ہنسنے لگا اور میز سے ایک کتاب اٹھاتے ہوئے اس نے پوچھا
"آپ کو یہاں رہتے ہوئے کتنا عرصہ گذر چکا ہے۔"

"پرسوں دو سال پورے ہو جائیں گے۔" شفیع نے اطمینان سے جواب
دیا "لیکن اس مرتبہ یہ آخری امتحان ہے اور اکتوبر میں واپس ہندوستان چلا جاؤں گا۔"

اختر نے کہا "تو آپ بھی آئی۔سی۔ایس کا امتحان دے رہے ہیں؟"

"دے تو رہا ہوں۔" شفیع نے جواب دیا "لیکن پاس ہونے کی امید
کم ہی ہے۔ جب دلی میں رہ کر یہ امتحان پاس نہ ہو سکا لندن ایسے دلچسپ شہر
میں بھلا کب ہو سکے گا۔ پھر بھی کوشش کی جا رہی ہے۔ سنتے ہیں حرکت میں
برکت ہوتی ہے۔"

"ہوتی ہوگی۔" اختر نے بے پروائی سے کہا "ہمیں تو ہمیشہ بغیر حرکت
کے ہی برکت ملتی رہی ہے۔"

شفیع نے کہا "پھر آپ کا سلسلہ مرشدوں سے ملتا ہوگا۔"

اختر کو ہنسی آ گئی اور وہ اس کرب انگیز شام کے بارے میں بالکل بھول
گیا جس نے اس کے کلیجے میں اپنے ٹیڑھے پنجے گاڑ دیئے تھے۔

شفیع اور اختر کی دوستی مہینوں کی منزلیں دنوں میں طے کر گئی اور

وہ جلد ہی ایک دوسرے کو پنجابی کی موٹی گالی دے کر مخاطب کرنے لگے۔
ایستھر کا خط آیا تھا کہ وہ بخیریت تمام میونک پہنچ گئی ہے۔ اور راستے میں کوئی
غیر معمولی واقعہ رونما نہیں ہوا۔ سعیدہ نے لکھا تھا کہ وہ اختر کو برابر اسی طرح
یاد کر رہی ہے اور اس کے لئے ایک اونی ٹی کوزی بنا رہی ہے جس کے ایک
طرف رنگ برنگی تیتری کی تصویر ہے اور دوسری جانب مٹیالے رنگ کا ایک پھول
بنایا جا رہا ہے۔ اباجی کی چھٹی آئی تھی کہ بیٹا ہر گھڑی علم کے لئے کوشاں رہو اور
اگر اس کی تلاش میں تمہیں چین کا سفر بھی اختیار کرنا پڑے تو ہرگز ہرگز گریز نہ کرنا۔
یہی وہ چیز ہے جس سے انسان دیگر جانداروں سے ممتاز ہوتا ہے اور خاندان میں
نام پیدا کرتا ہے۔ آخر میں انہوں نے لکھا تھا کہ عزیزم تمہارے ایک دوست
خلیل صاحب تشریف لائے تھے انہوں نے مجھ سے پچاس روپے کی رقم کا مطالبہ
کیا جو تم نے ان سے کسی زمانے میں ادھار لی تھی۔ میں نے رقم انہیں دے کر
رسید لے لی ہے اور اس کی نقل تمہیں بھیج رہا ہوں ——— رسید کی نقل اباجی کی
لکھائی میں نہیں تھی بلکہ منشی نے اسے روکڑ پر لکھنے والی روشنائی سے رقم کیا
تھا۔ شفیع نے ایستھر اور سعیدہ کے خط پڑھے لیکن اباجی کا خط پڑھنے سے یہ
کہہ کر انکار کر دیا کہ یار میرے پاس بھی ایسے بہت سے خط آیا کرتے ہیں لیکن میں نے
انہیں کبھی نہیں پڑھا۔ بند کے بند ٹرنک میں ڈالے جاتا ہوں گھر پہنچ کر کھولوں گا۔

"اور وہ خط تمہارے والد کے ہوتے ہیں؟" اختر نے پوچھا۔

"ہاں انہی کے ہوتے ہیں۔" شفیع نے کہا "قبلہ گاہی خواہ مخواہ تکلف سے
کام لیتے ہیں ان سے کوئی پوچھے کہ راجہ صاحب آپ کو اس کے سوا کوئی اور مشغلہ

ہاتھ نہیں آتا؟"

"مشغلہ!" اختر نے حیرانی سے کہا۔ "اولاد کی نگہداشت تو والدین کا فرض ہے۔ اور ہزاروں میل دور بیٹھے ہوئے والدین خطوں کے ذریعے ہی اپنے بچوں کی نگہداشت کر سکتے ہیں۔"

شفیع نے کہا: "میں اولاد اور اس کی نگہداشت کا قائل نہیں۔ ہمارے وجود ہمارے والدین کی مالش گری کا نتیجہ ہیں۔ انہیں معلوم بھی نہیں ہوتا کہ ہمارے شفیع یا اختر پیدا ہو جائے گا۔ وہ فطرت کے تقاضوں سے مجبور ہو کر محوِ اختلاط رہتے ہیں اور ایک دن اندھی اور بہری قدرت ان کی گود میں شفیع یا اختر ڈال دیتی ہے۔ اور وہ اس بچے کو اپنی ملک تصور کر کے اسے اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے لگتے ہیں۔ بچے کا یہ قصور ہوتا ہے کہ وہ ان کے یہاں پیدا ہو جاتا ہے اور والدین کو یہ مان ہوتا ہے کہ یہ ان کی تخلیق ہے۔ جب تک وہ ان کی نگاہوں کے سامنے رہتا ہے اسے طور بے طور نصیحتیں ہوتی رہتی ہیں۔ اور جب وہ دور چلا جاتا ہے تو لمبے لمبے خطوں کے ذریعے ہر گھڑی اسے یاد دلاتے رہتے ہیں کہ دیکھنا اپنے خالق کو نہ بھول جانا ——— آج تک شاید ہی کسی باپ نے سوچا ہو گا کہ بچے فطرت کے تقاضوں کی اولاد ہیں۔"

"بس بس!" اختر نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "خدا کے لئے جانے دو۔ تم اپنے الد کے خط نہیں کھولتے نہ سہی لیکن مجھے اس طرح بور نہ کرو۔ میں تو تمہارے لسفے کا بال باندھا غلام ہوں۔"

شفیع نے اختر کو جہاں سارے ہندوستانی اور انگریز دوستوں سے

متعارف کرایا وہاں وہ اسے اپنی انسٹیٹیوٹ بھی لے گیا جہاں آئی۔ سی۔ ایس کے بہت سے امیدوار تعلیم پاتے تھے۔ اختر کو یہ درسگاہ پسند نہ آئی۔ اور اس نے وہاں داخلہ لینے سے انکار کر دیا۔ وہ لندن میں چند مہینوں کی زندگی کو آزادی سے گذارنا چاہتا تھا۔ ایسی زندگی جس میں کسی قسم کی پابندی نہ ہو۔ روک ٹوک نہ ہو اور کوئی احتساب کرنے والا نہ ہو۔ لندن پہنچتے ہی اس نے اپنے ذہن میں پرانا دستور العمل پھر وضع کر لیا تھا کہ امتحان سے ایک ماہ پیشتر وہ اپنے آپ کو کمرے میں مقید کر کے روزانہ بیس گھنٹے مطالعہ کیا کرے گا اور کوئی کتاب حرف بحرف پڑھنے سے دریغ نہ کرے گا جو اس کے امتحان سے دور کا بھی واسطہ رکھتی ہو گی۔ کالج میں بھی اس کا یہی طریق کار رہا تھا۔ تیئیس مہینے وہ ہنس کھیل کر اور سینماؤں میں راتیں بتا کر ضائع کیا کرتا اور آخری مہینے نئی کتابیں خرید کر چوبار میں اپنے آپ کو مقفل کر لیا کرتا اور امتحان کے دن ہی گھر سے پاؤں باہر نکالتا یہاں پہنچ کر اس نے اتنی رعایت ضرور کی کہ ہر روز باقاعدگی سے ٹائمز کا مط شروع کر دیا اور شام کو مس مارگریٹ کے گھٹیا سے سکول میں جا کر ناچنے کی مشق کرنے لگا۔ دلّی میں کئی برس کے پرچوں کا لندن کے پرچوں سے مقابلہ کر کے اختر کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ پاس ہو گا اور ضرور ہو گا اور ارضی و سماوی کوئی بھی طاقت اسے ڈپٹی کمشنر کے عہدے سے محروم نہ رکھ سکے گی۔ اس نے شفیع کو پرانے پرچ بڑے انہماک سے حل کرتے ہوئے دیکھ کر کئی مرتبہ کہا تھا کہ جن صحیفوں کی گتھیاں سلجھانے میں تم اپنی جان یوں ہلکان کرتے رہتے ہو میں انہیں بائیں ہاتھ حل کر سکتا ہوں اور شفیع کو اب اس کی باتوں پر یقین بھی آ چلا تھا کیونکہ وہ جس

سوال کی طرف اشارہ کرتا اختر بلا تکلف اس پر ایک تقریر جھاڑ دیتا اور ٹاٹا کرتا ہوا کمرے سے نکل جاتا۔

ایستھر کے خط برابر آ رہے تھے اور وہ میونک یونیورسٹی لائبریری سے تاریخ کی نایاب کتابوں کے اہم باب ترجمہ کر کے اسے بھیجتی رہتی تھی۔ اختر نے اس کے نوٹس ٹانکنے کے لئے مراکو چمڑے کی ایک نہایت خوبصورت سی فائل خریدی تھی جس کی ضخامت میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ سعیدہ کی ٹی کوزی اسے مل گئی تھی اور اختر نے یارڈلے سینٹ کی ایک بڑی سی شیشی اس میں رکھ کر اپنے بکس میں محفوظ کر لیا تھا۔ ناشتہ کرنے کے بعد وہ ہوسٹل سے نکل جاتا اور دن بھر پیکاڈلی کی کوچہ گردی کرنے کے بعد شام گئے واپس آتا۔ شفیع اپنی کتابوں سے نگاہ اٹھا کر مسکرا کر اسے دیکھتا اور ایک آنکھ میچ کر پوچھتا "کیوں؟" اور اختر ہنس کر کہتا "بس دیکھتے جاؤ۔"

جین سے اختر کی ملاقات ایزاک والٹر کی دوکان کے باہر ہوئی۔ اس نے ایک پرچی پر کچھ لکھنے کے لئے اپنا پین کھولا اور اس کا کیپ ہاتھ سے چھوٹ کر پٹڑی کے پاس ایک ٹیکسی کے نیچے چلا گیا۔ اختر نے زمین پر گھٹنے ٹیک کر اس کا کیپ اٹھایا اور رومال سے صاف کر کے جین کو پیش کیا اور وہیں سے ان کی دوستی شروع ہو گئی۔ دونوں دوکان میں داخل ہونے کے بجائے ایک قہوہ خانے میں جا کر قہوہ پینے لگے۔ جین نے بتایا کہ جس دوکان میں اختر چیزیں خریدنے کے لئے جانا چاہتا تھا وہ وہاں نوکری کی غرض سے آئی تھی۔ لیکن چونکہ پین کا کیپ گر جانے سے بدشگونی ہو گئی تھی اس لئے اس

نے مالک سے ملنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ جین چھریرے بدن کی کم عمر لڑکی تھی لیکن اس کے چہرے سے آزمودہ کاری ٹپکتی تھی اور اس کی آنکھوں میں حجاب نہیں تھا جو اس عمر کی لڑکیوں میں عموماً ہوا کرتا ہے۔ وہ بڑی بے تکلفی سے اختر کے ساتھ باتیں کر رہی تھی اور ماں اور سوتیلے باپ کے رویے پر امیدارنہ ی سے تنقید کئے جا رہی تھی۔ اختر نے یہ کہہ کر کہ یہ باپ لوگ خواہ سگے ہوں یا سوتیلے ایسے ہی ہوتے ہیں جین کو رائے دی کہ اگر آج ڈومینین چل کر فلم دیکھا جائے اور اس کے بعد ہائیڈ پارک کی سیر ہو جائے تو کچھ بُرا نہ ہوگا۔ جین رضا مند ہو گئی۔ اور وہ ایک ٹیکسی لے کر ٹاٹنہم کورٹ روڈ روانہ ہو گئے۔ راستے میں اختر نے ہولے سے جین کا ہاتھ دبایا تو اس نے ذرا سی مزاحمت بھی نہ کی۔ اختر کا بازو اس کی کمر کے گرد حمائل ہو گیا اور جین نے اپنا سر اس کے کندھے پر رکھ دیا جس سے باسی سینٹ کی ہلکی ہلکی خوشبو آ رہی تھی۔ خشکی کی وجہ سے اس کے بال کھردرے سے لگتے تھے۔ اور ان میں زندگی کی چمک ختم ہو چکی تھی۔ اختر نے اس کے کان پر جھکتے ہوئے پوچھا "میں تمہیں اچھا لگتا ہوں؟"

جین نے اس کو اپنے دونوں بازوؤں میں جکڑ لیا اور آنکھیں اوپر اٹھا کر کہنے لگی۔

"بہت اچھے لگتے ہو ڈارلنگ۔ تمہاری ناک اور تمہارا ماتھا مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے میں خواب میں کسی یونانی دیوتا کو دیکھ رہی ہوں۔ تم بے حد حسین ہو پیارے! کیا ہندوستان میں تمہارے جیسے اور نوجوان بھی ہیں؟"

اختر نے مسکرا کر اس کا پیار لے لیا اور کہا "کیوں نہیں۔ ہمارے خاندان میں سبھی ایک سے ایک بڑھ کر ہیں۔"

"اسی لیے تو" جبین نے گرفت کو مضبوط کرتے ہوئے کہا "تمہیں یہ حسن ورثے میں ملا ہے۔"

اختر نے جواب دیئے بغیر اسے سیٹ سے اٹھا کر اپنی گود میں بٹھا لیا اور اس کی سفید گردن پر اپنے گرم گرم ہونٹ رکھ دیئے۔

جب وہ فلم دیکھ کر باہر نکلے تو ہائیڈ پارک جانے والی بس تیار تھی۔ اختر اسے کھانے کی دعوت دیئے بغیر ساتھ لے کر بس میں سوار ہو گیا۔

ماربل آرک کی جانب وہ درختوں کے ایک جھنڈ میں گھاس کے تختے پر ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے تھے جبین نے کل شام سے کچھ نہیں کھایا تھا اور اس وقت وہ بوسوں سے اپنی بھوک مٹا رہی تھی۔ وہ بار بار اختر سے اس کی آنکھوں، اس کے بالوں، اور اس کی کشادہ پیشانی کی تعریف کر رہی تھی۔ اور اختر اپنے خیال میں محو اس اینگلو انڈین لڑکی کو یاد کر رہا تھا جسے وہ اپنی دوکان کے پچھواڑے جلترنگ سنانے لے گیا تھا۔ جبین کی کمر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے اس نے سوچا کہ اصل اور نقل میں کتنا فرق ہے۔ یہ لڑکی چونکہ خالص انگریز ہے اس لئے گھریلو بلی کی طرح کیا خرخر کر رہی ہے اور اس چھوکری کو چونکہ دیسی پیچ ملی ہوئی تھی کیسے بھڑکتی تھی۔ تھوڑی دیر کے لئے اسے دیس سے اور دیسی لوگوں سے نفرت ہو گئی اور وہ جی ہی جی میں جبین کو اور اس کے ہموطنوں کو سراہنے لگا۔

ایک بجے کے قریب جب وہ شفیع کے کمرے میں داخل ہوا تو اس

نے مسکرا کر نبیٹ کو کونے میں اڑا دیا اور اس کے کندھے پر زور سے ہاتھ مار کر کہنے لگا "زندہ باد"

شفیع نے ایک آنکھ میچ کر کہا "زندہ باد کے بچے سعیدہ کو خط نہیں لکھا"

"کیوں؟" اختر کھسیانا ہو گیا۔

"اس کا خط آیا ہے۔"

"تمہیں؟"

"مجھے کیوں آتا سالے۔ تجھے آیا ہے۔"

"کیا لکھا ہے؟" اختر نے اشتیاق سے پوچھا۔

شفیع نے تکیئے کے نیچے ہاتھ پھیر کر ایک کھلا لفافہ نکالا اور اس کی طرف بڑھا دیا۔ اختر نے جلدی جلدی سارا خط پڑھا اور جب ختم کر چکا تو خط کو تہہ کر کے شرارت سے چوما اور کہا۔

"یار یہ لڑکیاں بھی بڑی بھولی بادشاہ ہوتی ہیں۔ سیدھی سادی اللہ لوک۔ پتہ نہیں انہیں ڈراؤنے خواب کیوں آنے شروع ہو جاتے ہیں ——— او پیارے ان کڑیوں چڑیوں سے تو دستانے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ گرم کے گرم اور ملائم کے ملائم۔"

شفیع آنکھ جھپکے بغیر اس کی باتیں سنتا گیا۔ اور جب وہ چپ ہو گیا تو اس نے اختر کو ایک موٹی سی گالی دے کر کہا "اگر اپنی خالاؤں کو ایسا سمجھتا ہے تو انہیں تیے کیوں بتاتا پھرتا ہے۔ ایک کو وہاں لارا دے آیا دوسری کو جہاز پر جھانسے دیتا رہا اور اب یہاں پتہ نہیں کتنی چڑیوں کی مانگ میں سیندور بھر کر

پھونکیں مار مار کر اڑاتا رہے گا۔ اور اس پر شرم نہیں آتی کمینے کو۔ دانت نکال رہا ہے۔

اختر نے کہا: "ہنسی کی بات تو ہے ہی۔ ہنسوں نہ تو اور کیا کروں۔"

شفیع نے تلخ ہو کر کہا: "اچھا تجھ سے تو یہ ھقو ھقنی والا لاکھا اچھا ہے — بتا سعیدہ سے شادی کرنے کا وعدہ کر کے نہیں آیا؟"

"ہاں"۔ اختر نے ڈٹ کر کہا۔

"اور ایستھر سے شادی کی درخواست نہیں کی؟" شفیع نے پوچھا۔

"نہیں۔ ہرگز نہیں۔" اختر نے زور دے کر کہا۔ "خدا کی قسم ایسی تو کوئی بات بھی نہیں ہوئی۔"

شفیع نے کہا: "اور یہاں بھی ہر ایک سے مٹھار مٹھار کر باتیں کر کے اسے اس قسم کا یقین نہیں دلائے گا۔"

"توبہ جی۔" اختر نے ہنستے ہوئے کہا۔ "میں ان کو کیا سمجھتا ہوں۔"

شفیع نے جل کر کہا: "مر حرامی! دیکھنا کتے کی موت مرے گا — نہ تو پڑھتا ہے اور نہ بد معاشی کرتا ہے۔ پتہ نہیں کیا جھک مار تا رہتا ہے۔"

اختر نے جھک کر شفیع کے گال کا چٹاخ سے چوما لیا اور کہا: "بس چاچا ناراض ہو گئے۔"

شفیع نے آہستہ سے جواب دیا: "ناراض نہیں باجی۔ مجھے تو سعیدہ کا خیال آتا ہے۔"

اختر ہنس پڑا اور شفیع کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر کہا: "کیسی باتیں کرتا ہے یار۔ وہ تو میری جان ہے۔"

صدیقی صاحب نے سب کو اپنی سالگرہ پر گھر بلایا تھا۔ یہاں اختر کی باجی سے ملاقات ہو گئی اور پہلی ہی ملاقات میں ان کی خوب چونچیں ہوئیں۔ آج سے چھ سال پہلے باجی، باجی نہیں تھی بلکہ مس نعیمہ تھی۔ وہ یہاں ایف آر۔ سی۔ ایس کرنے آئی تھی۔ لیکن پڑھائی کی طرف توجہ دینے کی بجائے وہ اپنے دیس کے نوجوانوں کا زیادہ خیال رکھنے لگی تھی۔ جو لڑکیوں کے پیچھے لندن کی گلیوں میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ لیکن اگر باجی ذرا سی بھی حسین ہوتی تو شاید یہ نوبت نہ آتی۔ لندن پہنچ کر اس نے اپنے ہم وطنوں کی توجہ جذب کرنے کا یہ طریق اختیار کیا کہ انہیں اپنے دیس اور تمدن کا واسطہ دے کر قدم قدم پر ٹوکنے لگی۔ لڑکے بالے اس کی بات تو خیر کیا مانتے۔ یوں ہی اوپرے جی سے اس کا ادب کرنے لگے اور وہ مس نعیمہ سے باجی نعیمہ بن گئی۔ رفتہ رفتہ اس کا نام لینا بھی سوئے ادب سمجھا جانے لگا اور وہ صرف باجی ہو کر رہ گئی۔

اختر نے کہا: "باجی اور ساری باتیں چھوڑو۔ اتنا بتاؤ کہ یہ کم بخت ایف۔ آر۔ سی۔ ایس بلا ہو کر آپ سے کیوں چمٹ گیا۔"

باجی نے منہ پھلا کر کہا: "پتہ ہے کتنا مشکل امتحان ہے یہ! نوے فی صدی امیدوار فیل ہوتے ہیں اور پھر مجھے پڑھنے کو وقت بھی کہاں ملتا ہے۔"

"کیوں۔" اختر نے حیران ہو کر پوچھا "میرا تو خیال ہے کہ لندن میں اس قدر فراغت ہوتی ہے کہ انسان بے کار بیٹھے بیٹھے کر خودکشی پر آمادہ ہو جاتا ہے۔"

"خوب ہے۔" باجی نے مسکرانے کی کوشش کی: "لیکن یہ فراغت مجھے تو کبھی نصیب نہ ہوئی۔"

"مصیبت تو یہ ہے۔" اختر نے مسکرا کر کہا: "کہ آپ لڑکا نہیں ہیں۔ ورنہ تین چار گھنٹے لڑکیوں کے ساتھ گذارنے کے بعد سارے دن میں اور کرنا ہی کیا ہوتا ہے۔"

باجی نے تنک کر کہا: "تو آپ نے بھی پر پرزے نکال لیے۔"

اختر نے سنجیدگی سے کہا: "پر پرزے تو میں لاہور ہی سے نکال کر چلا تھا۔"

شفیع نے کہا: "لیکن تو تو کہتا تھا کہ تو بحری جہاز سے یہاں پہنچا ہے۔"

"تو بالکل گدھا۔" اختر نے جھوٹ موٹ جھلا کر کہا: "آتی دفعہ پر پرزے بالکل چھوٹے چھوٹے سے تھے لیکن لندن میں رہ کر بڑے بڑے پروپیلر بن جائیں گے اور ہندوستان لوٹنے کے لئے مجھے بحری جہاز کا ممنون احسان نہ ہونا پڑے گا۔"

صدیقی صاحب کو زور کی ہنسی آگئی اور ان کے ساتھ مس ہوگن بھی مسکرانے لگیں۔

اختر نے کہا: "باجی! صدیقی صاحب چائے پر ہی ٹرخا دیں گے یا بادہ نوشی اور بادہ پیمائی کا پروگرام بھی رہیگا؟"

باجی نے تیوری چڑھا کر اختر کو دیکھا اور احتجاجاً جواب نہ دیا۔

نرولا نے صدیقی صاحب کے کان میں اختر والی بات پر غور کرنے کے بارے میں کہا اور صدیقی صاحب مسکرانے لگے۔

شفیع نے کہا: "باجی کے سامنے ایسی باتیں کرتے ہوئے تجھے شرم نہیں آتی؟"

اختر نے سر ہلا کر کہا: "پچھو میں سمجھا نہیں باجی کے سامنے اعتکاف میں بیٹھ جاؤں اور شام کو پب جا کر اس کلمہ پڑھنے والے منہ میں بیئر انڈیلنے لگو

مس ہوگن نے کہا: "کسی کی کمزوریوں کو ایسی میٹنگ میں اجاگر کرنا سراسر زیادتی ہے۔"

اختر نے سر جھکا کر کہا: "معاف کیجئے گا۔ میرا مطلب شفیع سے ہرگز نہیں تھا میں نے تو ایک عام آدمی کی مثال دی تھی۔ جو ایسا کرتا ہے، کیا کرتا ہوگا یا آئندہ کیا کرے گا۔"

اس پر سب ہنس پڑے اور باجی کے چہرے پر بھی مسکراہٹ کی ایک ہلکی سی رو آتے آتے رہ گئی۔

"ہیلو ایوری باڈیز۔" کمرے میں دو یورپین لڑکیاں داخل ہوئیں۔ اور سب اپنی اپنی جگہ پر اٹھ کھڑے ہوئے۔

گول چہرے والی لڑکی نے مسکرا کر کہا: "ہمیں افسوس ہے کہ ہم دیر سے پہنچیں۔ مجھے اپنے والد کو تار بھیجنا تھا اور تار گھر میں اتنی بھیڑ تھی کہ ہماری باری بہت دیر سے آئی۔"

صدیقی صاحب نے کوئی بات نہیں! کوئی بات نہیں!! کہنے کی کوشش کی تو اختر نے بات کاٹ کر کہا: "اگر آپ کو تار نہ بھی بھیجنا ہوتا اور پھر بھی آپ دیر سے آتیں تو بھی ہمیں شاید اسی قدر انتظار کرنا پڑتا۔"

اس لڑکی نے مسکرا کر اختر کی طرف دیکھا تو صدیقی صاحب نے ذرا پیچھے ہٹ کر اختر کو مخاطب کر کے کہا۔

"ان سے ملیے ——— مس سٹیلا! آپ ایف۔ آر۔ سی۔ ایس کے آخری سال میں ہیں اور یہ ہیں مس ہیزل! ہنٹلے اینڈ پامر کے شعبہ اشتہارات کی انچارج ——— اور آپ اختر ہیں اور آئی۔ سی۔ ایس کے امتحان میں شامل ہونے کی غرض سے یہاں تشریف لائے ہیں۔"

اختر نے قدرے جھک کر کہا "آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی ——— لیکن معاف کیجیے گا اس وقت مجھے بڑی زور کی چھینک آ رہی ہے میں ابھی آتا ہوں۔" اور وہ تیزی سے قدم اٹھاتا باہر نکل گیا۔ مس ہیزل کو یہ بات بڑی ناگوار گزری۔ باجی نے بھی اختر کے اس رویے پر ناک بھوں چڑھائی ——— لیکن سٹیلا مسکراتی رہی۔

خادمہ چائے لے کر اندر داخل ہوئی تو صدیقی نے کشتی اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا "اگر کوئی میرا پتہ پوچھتا ہوا اوپر آئے تو اسے ذرا کمرے میں بھیج دینا۔"

کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اختر نے زور سے کہا "غضب خدا کا جب میں باہر تھا تو مجھے چھینک نہیں آئی اور اب جب میں اندر آ گیا ہوں تو میری ناک میں پھر سوزش ہونے لگی ہے۔"

باجی نے چڑ کر کہا "تو پھر آپ باہر ہی رہیے۔"

نرولا اور شفیع پنجابی میں باتیں کر رہے تھے اور مس ہوگن اور باجی چائے بنا رہی تھیں۔ صدیقی ہیزل سے اس کے نئے اشتہاروں کی عبارتیں سن رہا تھا اور وہ اپنی منی سی ناک پر گھڑی گھڑی عینک جما رہی تھی۔

اختر نے سٹیلا کے قریب کرسی کھینچتے ہوئے کہا "میرا دل آپ سے باتیں کرنے کو چاہتا ہے۔ لیکن مجھے باجی سے ڈر لگتا ہے۔ وہ اس بات کی کڑی نگرانی کرتی ہے کہ ہم ہندوستانی لڑکے انگریز لڑکیوں سے گھل مل کر باتیں نہ کریں۔"

سٹیلا نے مسکرا کر لب کھولے تو اختر نے اس کا جواب سنے بغیر باجی سے کہا "باجی میں سٹیلا سے چند باتیں کر لوں؟"

باجی نے قہر آلود نگاہوں سے اختر کو گھورا اور ہیزل سے چینی کی مقدار پوچھنے لگی۔

سٹیلا نے رومال سے اپنی گھڑی کا شیشہ صاف کرتے ہوئے پوچھا "آپ ہمیں برا کیوں سمجھتے ہیں؟"

"برا سمجھنے کی بات تو ہے ہی"۔ اختر نے دونوں ہاتھ کھول کر کہا "آپ لوگ ہمارے حاکم ہیں اور ہر بندہ آقا کے خلاف نفرت کے جذبات رکھتا ہے"

سٹیلا پھر مسکرائی اور اس کے بھرے بھرے گالوں میں دو ننھے ننھے گڑھے پیدا ہو گئے۔ اس نے اپنے گھنے بالوں کو سنوارتے ہوئے کہا۔

"شکر ہے میں آپ کی حاکم نہیں ورنہ مجھ سے بھی آپ کو خدا واسطے کی دشمنی ہو جاتی۔"

"کیوں؟" اختر نے حیران ہو کر پوچھا۔

"میں سوس جرمن ہوں"۔ سٹیلا نے جواب دیا "میرا باپ سوئٹزر لینڈ کا رہنے والا ہے اور میری ماں جرمن تھی۔ اور مجھے انگریزوں سے دور کا

ی تعلق نہیں۔"

"یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے"۔ اختر نے خوش ہو کر کہا: "اس طرح مجھے
پ سے باتیں کرتے وقت نسبی جھجک نہ ہو گی اور میں......"

"بیشک" سٹیلا نے بات کاٹ کر کہا: "مجھے تو ہندوستانی بہت ہی
چھے لگتے ہیں۔ میں نے ہندوستان سے متعلق بہت سی کتابیں پڑھی ہیں اور
یرا ارادہ ہے کہ اس ملک کی سیر کروں۔"

"ضرور! ضرور!" اختر نے کہا: "آپ لاہور آئیں ہم آپ کو تانگے کی
سیر کرائیں گے۔ مغلیہ عمارتیں دکھائیں گے۔ اور سانپ اور نیولے کی لڑائی
کا تماشہ کروائیں گے۔"

"کیوں نہیں۔" سٹیلا نے جواب دیا: "موقع ملا تو میں ضرور وہاں جاؤنگی
مجھے ہندوستان بہت ہی پسند ہے۔"

سٹیلا بھرے بھرے جسم کی بوٹا سی لڑکی تھی۔ میدہ اور شہاب رنگ
بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اور گھنے بال جنہیں وہ موٹے موٹے بل دے کر کانوں
کے پاس لٹکائے رکھتی تھی۔ اس کی ستواں ناک آگے سے قدرے اونچی تھی اور
نتھنوں کی محرابیں سر کے ذرا سے اٹھ جانے سے نمایاں ہو جاتیں۔ سٹیلا کی ٹھوڑی
نوکیلی نہ تھی اور اس کے جبڑے کا خم معدوم سا تھا۔ اس کے پپوٹے ہر وقت
بوجھل رہتے اور جب وہ آنکھ جھپکتی تو یہ بوجھل پردے ایک مرتبہ گر کر بڑی مشکل
سے اوپر اٹھتے۔ اس کے بال بالکل سنہری نہ تھے بلکہ چائے کی رنگت رکھتے
تھے۔ لیکن ماتھے اور کنپٹیوں کے پاس بے شمار زریں روئیں ان چائے

رنگے بالوں کے قدموں سے چمٹی رہتیں۔ مسکراتے وقت اس کے گالوں میں
دو ننھے ننھے گڑھے پڑ جاتے اور ٹھوڑی ذرا نوکیلی ہو جاتی اس لئے وہ اکثر
مسکراتی رہتی۔

اگلے دن شام کو جب اختر شفیع کے کمرے میں ٹوپی کو برش کرنے
آیا تو شفیع نے کہا۔

"جا تو بڑے شوق سے رہے ہو لیکن یہ لڑکی ان چھوکریوں میں
سے نہیں ہے جو نوکری کی تلاش میں پکاڈلی سکوائر کے آس پاس گھوما کرتی
ہیں یہ رئیس زادی ہے۔ اس کا باپ پیرس کا مشہور ڈاکٹر ہے اور یہ
اس کی اکلوتی بچی ہے اس سے عشق کرنے کا خیال لے کر کئی فرنگی بچے
فوج میں بھرتی ہو گئے اور بہت سے ہندوستانی اس کی تصویریں سینوں
سے لگا کر امتحان دیئے بغیر وطن لوٹ گئے۔ یہ کسی چیز پر سنجیدگی سے غور کرنے
کی عادی نہیں اور محبت کرنے کے معاملے میں تو بالکل برف ہے۔"

اختر نے کہا: "لیکن تمہیں یہ وہم کیوں ہو رہا ہے کہ میں اس سے
محبت کرنے چلا ہوں میں تو صرف اس لئے جا رہا ہوں کہ اس نے مجھے پکچر پر
بلایا ہے۔ اور کسی خاتون کی دعوت سے انکار سراسر بدتمیزی ہے۔"

"ٹھیک ہے"۔ شفیع نے ایک لمبا کش کھینچ کر کہا: "خواتین سے
اقرار کئے جاؤ اور دو مہینے کے بعد جو امتحان ہو رہا ہے وہاں پرچوں پر دو
دلوں اور ایک تیر کی تصویر بنا کر چلے آنا۔"

"دو مہینے تو بہت ہوتے ہیں"۔ اختر نے ماچس اٹھا کر کہا۔ "امتحان

کی تیاری تو ایک ہفتے میں ہو جاتی ہے۔"

سٹیلا نے اختر کو ٹھیک چھ بجے لندن پے وکٹوریہ پہنچنے کا وقت دے رکھا تھا لیکن لائی سٹر سکوائر پر گاڑی بدلنا بھول گیا اور سیدھا چیرنگ کراس پہنچ گیا۔ وہاں سے پہلی گاڑی میں جگہ نہ ملی اور جب وہ لندن کے وکٹوریہ پہنچا تو ساڑھے چھ ہو چکے تھے اور سٹیلا ویٹنگ روم کے باہر اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اختر نے اپنی ٹوپی اتار کر کہا۔

"سٹیلا! مجھے بے حد افسوس ہے کہ میں وقت پر نہ پہنچ سکا میرے یہاں چند ایسے ہندوستانی بزرگ آ گئے جنہیں اگر میں یوں چھوڑ آتا تو وہ میرے والد کو جھوٹا سچا خط لکھ دیتے۔"

سٹیلا مسکرائی اور چاکلیٹ کی ٹکیہ اس کی طرف بڑھا کر بولی۔ "کوئی بات نہیں۔ ہم لیٹ شو دیکھ لیں گے۔ تم نے اچھا کیا جو اپنے مہمانوں کو شکایت کا موقعہ نہ دیا۔ مجھے بزرگ قسم کے لوگ بڑے پیارے لگتے ہیں۔"

وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے پکاڈلی سرکس کا چکر کاٹنے لگے اور جب وہ ایک مختصر سے ریستوران کے سامنے سے گزرے تو سٹیلا نے پوچھا۔ "تم نے کھانا تو نہیں ہو گا اختر؟"

"نہیں ہو۔" اختر نے ہولے سے کہا۔ "لیکن مجھے اس وقت بھوک نہیں اور آج میں فاقہ کرنا چاہتا ہوں۔"

"تو پھر قہوہ پیتے ہیں۔" سٹیلا نے اصرار کیا اور وہ دونوں ریستوران میں داخل ہو گئے۔

قہوہ نوشی کے دوران میں سٹیلا نے انمل بے جوڑ سی باتیں شروع کر دیں۔

"میرے ڈیڈی" سٹیلا نے فخریہ کہا۔ "اتنے اچھے ہیں کہ تمہیں کبھی یقین ہی نہ آئے کہ والد بھی ایسے ہو سکتے ہیں۔ میری ماں کے مرنے کے بعد انہوں نے شادی نہیں کی اور اپنی فرصت کے اوقات میری تربیت کے لئے وقف کر دیئے۔ میں بھی شادی کا ارادہ نہیں رکھتی۔ لیکن اس طرح میری ماں کی روح کو بڑا دکھ ہو گا۔ میں نے اپنی ماں نہیں دیکھی لیکن مجھے معلوم ہے کہ وہ کیسی ہو گی۔ کس طرح باتیں کرتی ہو گی۔ اور کیسے چلا کرتی تھی۔ تمہاری ماں تو زندہ ہے۔ تم بڑے خوش قسمت ہو۔ تمہارے چہرے پر جو یہ ایک شرارت سی کھیلتی رہتی ہے۔ تمہاری ماں کے زندہ ہونے کی دلیل ہے۔ میرے ڈیڈی مجھ سے بڑا پیار کرتے ہیں لیکن وہ ماں تو نہیں بن سکتے انہوں نے مجھے اپنی مرضی سے شادی کرنے کا پورا اختیار دے رکھا ہے۔ میں چاہے کسی لنش میں سے شادی کروں وہ برا نہیں مانیں گے لیکن میں بیاہ کرنا نہیں چاہتی۔ مجھے شادی سے نفرت ہے اور جب میں ڈاکٹری کی ڈگری لے لوں گی تو پریکٹس بھی نہیں کروں گی۔ مجھے ڈاکٹری بھی اچھی نہیں لگتی۔ دراصل مجھے کوئی چیز بھی اچھی نہیں لگتی۔ پتہ نہیں اچھی چیزیں دنیا کے کس گوشے میں رہتی ہیں۔"

اختر چپ چاپ اس کی باتیں سنتا رہا اور قہوہ پیتا رہا۔ لیکن جب سٹیلا نے دوبارہ کہا کہ مجھے کوئی چیز بھی اچھی نہیں لگتی تو اختر نے اپنی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"یہیں بھی اچھا نہیں لگا؟"

سٹیلا نے مسکرا کر کہا۔ "ذرا! ذرا!" اور اس کے گالوں میں ذرا ذرا سے گڑھے پڑ گئے۔

اختر نے اپنی پیالی اٹھاتے ہوئے کہا۔ "شکر ہے تمہیں کچھ تو اچھا لگا۔ تھوڑا تھوڑا سا ہی سہی۔"

پکچر دیکھتے وقت اختر نے اس کی طرف جھک کر کہا۔ "میں تھک گیا ہوں۔ تمہارے کندھے پر سر رکھ لوں؟"

"ضرور۔" سٹیلا نے اس کی طرف سرک کر جواب دیا اور اختر نے اپنا سر اس کے کندھے پر رکھ کر ہولے سے دبا دیا۔

سٹیلا نے پوچھا۔ "تمہیں نیند تو نہیں آ رہی؟"

"ہاں۔" اختر نے جمائی لے کر کہا۔ "میں سرِ شام سو جانے کا عادی ہوں لیکن خیر اب تو پکچر دیکھ کر ہی چلیں گے۔" پھر اس نے اپنا سر اٹھا کر پوچھا۔ "تمہیں بوجھ تو نہیں لگ رہا۔ میرا سر ذرا وزنی ہے۔"

"نہیں نہیں۔" سٹیلا نے کندھا اوپر اٹھا کر کہا۔ "سر کا بھی کوئی بوجھ ہوتا ہے۔"

اختر نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر انگلیوں کی کنگھی ڈال دی اور آنکھیں بند کر لیں۔

سٹیلا اور اختر کی ملاقاتیں طویل ہونے لگیں اور ایستھر کے خطوں کے جواب میں رخنے پڑنے لگے۔ سعیدہ کے جذباتی خطوط کا شفیع کو بڑا پاس

تھا اس نے ایک دن آپ ہی آپ اس کا جواب لکھ دیا کہ اختر چونکہ پڑھائی میں مشغول رہتا ہے اس لئے اس نے خط لکھنے بھی ترک کر دیئے ہیں۔ لیکن وہ تمہیں خط لکھنے کے لئے اکثر کہتا رہتا ہے۔ اباجی کو اختر کبھی کبھار ایک مختصر سی چٹھی لکھ دیتا اور مہینے بھر کے لیے ان کی تسلی ہو جاتی۔ اختر نے شفیع کو خطوں ہی خطوں میں ایستھر سے اچھی طرح متعارف کرا دیا تھا اور وہ باقاعدگی سے ایک دوسرے کو چبھتے ہوئے فقرے اور سلام بھیجنے لگے تھے۔ لیکن جب ایستھر کے خط کے جواب میں اختر کی بجائے شفیع کا خط گیا تو اس نے لکھ بھیجا کہ اختر اگر عدیم الفرصتی یا سہل انگاری کی وجہ سے مجھے خط نہیں لکھ سکتا تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ مجھے سرکاری قسم کی چٹھیاں لکھی جائیں جن کا اجرا پرائیویٹ سیکرٹری کے دستخطوں سے ہوا کرتا ہے۔ اور شفیع نے ایستھر کا نام تک لینا چھوڑ دیا۔

سعیدہ نے شفیع کو شکریے کی ایک لمبی ساری چٹھی لکھی تھی اور اس سے درخواست کی تھی کہ وہ اپنی بہن کو کبھی نہ بھولیں اور ہر آٹھویں دسویں اسے اختر سے متعلق سب کچھ لکھتے رہا کریں۔ اس کے ساتھ ہی شفیع کو ڈی۔ ایم۔ سی سے کاڑھے ہوئے بوسکی کے چھ رومالوں کا ایک پارسل بھیجا تھا۔

سارا لندن کہرے کی لپیٹ میں آیا ہوا تھا اور سڑکوں پر وہ پہلے والی چہل پہل نہیں رہی تھی کسی کسی گھر میں جہاں ایک آدھ بوڑھا جوڑا رہتا تھا الاؤ بھی روشن ہو گئے تھے اور دریچوں پر دبیز پردے کھینچ دیئے گئے تھے۔

سٹیلا نے اختر کی ٹانگوں پر اپنا سمور دار کوٹ ڈال کر پوچھا۔ "تمہیں سردی تو نہیں لگتی؟"

اختر نے مسکرا کر جواب دیا۔ "لگتی تو تھی مگر اب نہیں۔"

سٹیلا نے کہا۔ "تو تم نے مجھے پہلے کیوں نہ بتایا؟"

اختر نے سگریٹ کی راکھ میز پوش پر جھاڑتے ہوئے کہا۔ "مجھ میں ابھی تک ذرا سی قوتِ برداشت باقی ہے۔ اس لئے نہ کہا۔"

سٹیلا اس کی کرسی کے پیچھے کھڑی ہوگئی اور اختر کے بالوں پر ہاتھ پھیر کر کہنے لگی۔ "تم اپنی ہر بات چھپاتے ہو۔ کبھی مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں؟"

اختر نے ایک ہاتھ سے اس کی کلائی پکڑ لی اور اسے کھینچ کر اپنی کرسی کے بازو پر بٹھا لیا۔ ایک لمحے کے لئے اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا اور کہا "میرے پاس کوئی بھی کہنے والی بات نہیں۔ میرے دل میں کوئی بھی راز نہیں اور مجھے ذرا سی تکلیف بھی نہیں۔ میں تم سے کہوں تو کیا کہوں۔"

سٹیلا نے کہا۔ "کوئی بات کرو۔ کسی قسم کی شکایت کرو۔ میرے خلاف تمہارے دل میں جو کچھ ہے سب کہہ ڈالو۔ مجھے ذرا سا بھی افسوس نہ ہوگا —— مجھے پتہ ہے میں تمہیں اچھی نہیں لگتی۔ اور تم صرف مروت کی وجہ سے میرے یہاں آتے ہو۔ مجھ سے ملتے ہو اور میرے ساتھ پکچر دیکھنے یا سیر کرنے نکلتے ہو۔"

اختر نے سگریٹ چٹکی سے اڑا کر ٹھنڈے آتشدان میں پھینک دیا اور سٹیلا کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر کہنے لگا۔

"تمہیں یہ وہم کس طرح ہوا کہ میں تمہیں اچھا نہیں سمجھتا بلکہ مجھے تم سے

پیار نہیں اور میں یہاں صرف مروتاً آتا ہوں۔ اگر تم مجھے اچھی نہ لگتیں تو میں اپنا وقت کیوں ضائع کرتا۔ ایستھر کو اس کے خطوں کے جواب کیوں نہ دیتا اور سعیدہ کو شفیع سے چٹھیاں کیوں لکھواتا۔ آخر تم نے یہ کیوں کہا —— جاؤ میں تم سے نہیں بولتا۔" اور اس نے سٹیلا کا چہرہ چھوڑ کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

سٹیلا نے تلملا کر اپنی باہیں اس کے گلے میں ڈال دیں اور کہا۔

"مجھے معاف کرنا اختر۔ مجھے محبت کرنا نہیں آتا۔ مجھے پتہ نہیں کہ کونسی بات کب کہنی چاہیئے اور کسی موقعہ پر کیسا برتاؤ کرنا چاہیئے۔ میں نے کبھی محبت نہیں کی۔ پہلے مجھے یہ بہت ہی چھچھورا سا کھیل لگتا تھا لیکن جب میں نے صدیقی کے یہاں تمہیں دیکھا تو میرا یہ فلسفہ اپاہج ہو کر رہ گیا —— تمہیں میری باتیں ناگوار گذری ہوں تو مجھے معاف کر دو۔ میں پھر کبھی بھی یوں نہ کہوں گی"

اختر نے مسکرا کر اس کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا اور اس کے سینے پر پیشانی رکھ کر کہنے لگا۔

"میں تو تمہارا حوصلہ دیکھ رہا تھا۔ سٹیلا! میں تم سے کبھی بھی ناراض نہیں ہو سکتا۔ تم تو میری جان ہو اور میں اپنی جان سے کبھی بیزار نہیں ہو

سٹیلا نے آہستہ سے پوچھا۔ "تمہیں ایستھر سے محبت نہیں؟"

"ہے" اختر نے اطمینان سے کہا۔ "مجھے ہر اچھی چیز سے پیار ہے"

"تم اس سے شادی کر رہے ہو؟" سٹیلا نے پوچھا

"نہیں"۔ اختر نے سر اٹھا کر جواب دیا۔ "شادی تو میں صرف سعید

سے کروں گا۔ میں نے اس سے وعدہ کر رکھا ہے۔"

نہ نہانے والی ایستھر کا خیال آگیا اور وہ سوچنے لگا کہ کیسا عجیب کھیل ہے کیسی تکلیف دہ بازی ہے لیکن اس کے ساتھ کتنی دلچسپ ہنگامہ پرور حیات بخش اور جاں فزا۔ اگر اس کھیل میں کرم کے سارے مہرے پٹ جائیں تو بساط ایک دھوبا دھایا دستر خوان بن کر رہ جائے۔ ایک چوخانہ میز پوش ہو جائے جس پر کاغذی پھولوں کے گلدستے پڑے رہتے ہیں۔ بے جان۔ بے بو!

”کوئی بات نہیں۔“ اختر نے کہا۔ ”مجھے کچھ ایسی بھوک بھی نہیں۔“

”میں بھوک مٹانے کی غرض سے نہیں کہہ رہی۔“ ستیلا نے ماچس اٹھا کر کہا۔ ”چلئے پی کر تم ذرا گرم ہو جاؤ گے۔ اور راستے میں تمہیں سردی نہیں لگے گی۔“

سٹوولیمپ کے نارنجی اور نیلے شعلے کیتلی کے پیندے سے لگ کر کناروں تک پھیلے ہوئے تھے اور کمرے میں آگ اور پیرافین کی ملی جلی بو دور تک پھیلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ستیلا خاموشی سے سر جھکائے سٹوولیمپ کے حروف پر اپنی انگلی رگڑ رہی تھی۔ اختر اٹھ کر اس کے پاس جا کھڑا ہوا اور آہستہ سے پوچھنے لگا۔

”میں ان شعلوں کی روشنی میں تمہاری شکل دیکھنی چاہتا ہوں۔ کیسے بتی بجھا دوں؟“

ستیلا نے کوئی جواب نہ دیا اور اسی طرح ناخن رگڑتی رہی۔ اختر نے آگے بڑھ کر بتی گل کر دی اور نارنجی شعلوں کی روشنی اچک کر ستیلا کے چہرے اور بالوں پر پہنچ گئی۔ اختر نے اس کی ٹھوڑی اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

ستیلا نے جیسے اپنے آپ سے کہا: ”کتنا اچھا ہوتا اگر سعیدہ تمہاری چچازاد نہ ہوتی۔ یا میں پیرس میں پیدا ہونے کی بجائے بمبئی میں جنم لیتی۔ لیکن ایسا کیوں ہوتا۔ قدرت کا مجوزہ نظام کیونکر بدلتا؟“ پھر اس نے اختر کے کندھے پر کہنی رکھ کر کہا۔ ”یوں نہیں ہو سکتا اختر کہ میں تمہارے ساتھ ہندوستان چلی چلوں تم اور سعیدہ شادی کر لینا۔ میں وہاں پریکٹس کیا کروں گی اور کبھی کبھار تم سے ملنے آجایا کروں گی۔“

اختر نے اسے تھپکتے ہوئے کہا۔ ”تم انہونی باتیں کیوں کرتی ہو۔ کوئی اتنی ساری زندگی یوں بھی گذار سکتا ہے؟ پہلے بھی کبھی ایسا ہوا ہے!!“

”نہیں ہوا تو کیا ہے۔“ ستیلا نے وثوق سے کہا۔ ”میں ایسے کر سکتی ہوں۔ مجھے اپنے آپ پر بھروسہ ہے بڑا اعتماد ہے۔ اگر میرا ایک اعتماد مجروح ہو گیا تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ میرے سارے مان ٹوٹ جائیں گے۔“

”شاید تمہارا کوئی مان بھی نہ ٹوٹے۔“ اختر نے دکھے دل سے کہا۔ ”لیکن ایسی باتیں نہ کرو۔ مجھے بڑی تکلیف ہوتی ہے کیا تم مجھے تکلیف دینا چاہتی ہو؟“

ستیلا پھر اس کے ساتھ چمٹ گئی اور سرگوشی کرنے لگی۔ ”کبھی بھی نہیں اختر! کبھی نہیں۔ خدا کرے میں تمہیں تکلیف دینے سے پہلے ختم ہو جاؤں خدا کرے........“

اختر نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور اس کے بالوں میں اپنا چہرہ چھپا لیا۔ ستیلا ہولے ہولے سسکیاں بھرنے لگی۔ اور اختر کا سویٹر اور قمیص آنسوؤں سے بھیگ گئی۔ اسے اسی طرح رونے والی سعیدہ یاد آگئی۔ ایک آنسو

"دیکھو اب۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ؟"

لیکن جب سٹیلا کا چہرہ اوپر اٹھا تو اس کی آنکھیں دھانی آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔

"یہ کیا؟" اختر نے سٹیلا کی ٹھوڑی چھوڑ کر کہا۔ "اگر تم ایسے ہی کرو گی تو میں واقعی تم سے بولنا بند کر دوں گا۔ اور تمہارے یہاں نہیں آؤں گا۔"

سٹیلا نے جلدی جلدی آنکھیں جھپک کر آنسو گرا دیئے اور رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

"میں روتی تو نہیں۔ یہ تو سٹوو کی گیس کا اثر ہے۔ اگر میں۔ ۔ ۔ ؟ ۔ ۔"

اختر نے بات کاٹ کر کہا۔ "اچھا تو پھر ہنس کر دکھاؤ۔"

سٹیلا ذرا سا مسکرائی۔ اختر نے کہا۔ "یوں نہیں اچھی طرح ہنسو"

اور جب وہ ہنسی وہی دونوں گڑھے پل بھر کو اس کے گالوں میں نمودار ہوئے اور پھر غائب ہو گئے۔

اختر نے کہا۔ "ایک بار پھر لیکن زیادہ دیر تک۔"

اور اس مرتبہ جب وہ زیادہ دیر کے لئے ہنسی تو شدت سے سٹوو لیمپ پر ناخن رگڑنے لگی اور رگڑ کی یہ آواز اس کی پھیکی ہنسی سے نمایاں تھی۔

صبح صبح شفیع نے اختر کو سعیدہ کا ایک لفافہ دیا جس کے منہ

پر لاکھ کی ایک چھوٹی سی مہر لگی ہوئی تھی اور کونے میں "صرف اختر کے لئے" لکھا تھا۔ شفیع نے کرسی کھینچتے ہوئے کہا۔ "رات میرے سر میں درد تھا اور میں تمہارا انتظار کیئے بغیر سو گیا۔"

اختر نے لفافے کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "بھلا سعیدہ کو یہ کیا سوجھی کہ خط کو ایسا پرائیویٹ بنا دیا۔ اب میں اسے نہیں کھولوں گا تم ہی کھولو اور پڑھ کر سناؤ۔"

"سؤر زادے"۔ شفیع نے صحیح تلفظ میں گالی دیتے ہوئے کہا۔ "اگر یہ خط میری نظروں سے گزرنا ہوتا تو سعیدہ اس پر مہر کیوں لگاتی؟"

اختر نے تکیئے کے نیچے ہاتھ پھیر کر سگریٹ کیس نکالا اور ایسٹ اینڈ والوں کی زبان میں جوابی گالی دے کر کہا۔

"بکواس نہ کیجئے بلکہ وہی کیجئے جو میں عرض کر رہا ہوں"

شفیع نے لفافہ کھولا اور خط پڑھنا شروع کیا۔

مینو تتو جی!

تمہیں ایک خبر سناتی ہوں۔ ایسی خبر جسے سن کر تمہیں اس کی سچائی پر یقین نہ آئے گا اور تم بھی میری طرح خوشی سے پاگل ہو جاؤ گے۔ پرسوں تایا جی کا خط ابا جان کے نام آیا تھا۔ جس میں انہوں نے میری اور تمہاری منگنی کے بارے میں لکھا تھا۔ ابا جان نے حامی بھر لی اور ہماری منگنی ہو گئی ہے۔ امی جان نے ڈھیر ساری مٹھائی اور پھل رکابیوں میں بھر کر ساتھ کے بنگلوں میں تقسیم کیئے اور وہاں سے امی کو اور مجھے مبارک باد کے اتنے رقعے آئے کہ

"میری لکھائی میں چاہتی ہے۔" اختر نے حیران ہو کر پوچھا "تمہیں
کیسے پتہ چلا؟"

"سوٗر کے گھگھو" شفیع نے چڑ کر کہا۔ "اس نے کہا جو ہے کہ اب
جو چاہے لکھنا۔ امی تمہارا خط نہیں پڑھیں گی۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں اسے اپنے ہاتھ سے لکھوں"۔ اختر نے
سیانوں کی طرح کہا۔

"اور کیا؟"

"تو بہت اچھا ایسا ہی کریں گے۔ اس میں کونسا تپ کرنا پڑتا ہے۔"

اسی دن دوپہر کو اختر سعیدہ کے خط کا جواب لکھ رہا تھا کہ ایستھر
کا لفافہ ملا۔

پیارے ایستھر!

پرسوں سے مجھے ایک ڈراؤنا خواب آ رہا ہے۔ اور مجھے یوں لگ
رہا ہے کہ کوئی عجیب سی قوت تمہیں وقت سے پہلے مجھ سے چھیننے لیے جا رہی
ہے۔ اگر واقعی یوں ہی ہوا تو میں کیا کروں گی۔ گو میں اچھی طرح سے جانتی ہوں کہ
ہماری خط و کتابت کی عمر چند دن اور رہ گئی ہے۔ پھر تم وائیکلڈ لینڈ چلے جاؤ گے
اور میں جرمنی کے کسی مدرسے میں استانی بن کر زندگی گزار دوں گی۔ لیکن میں
کیا کروں میرا جی گھبرا رہا ہے ہر چیز سے ہول آنے لگا ہے۔ اور مجھے نیند
آتی ہے تو میں سوتی نہیں۔ کہ پھر وہی خواب اپنے ٹیڑھے پنجے میرے ذہن میں
گڑو دے گا۔ اور میں چیخ مار کر بیدار ہو جاؤں گی۔ خدا کے لئے میری مدد

کرو میں تمہارے سامنے دو زانو ہو کر التجا کرتی ہوں کہ صرف ایک دن کے لئے
میونک آ کر مجھے اپنی صورت دکھا جاؤ اس کے بعد چاہے عمر بھر کے لئے اپنا
تصور میرے ذہن سے کھرچ دینا۔ میرا دماغ ماؤف کر کے چلے آنا۔ تمہیں اپنی
عزیز ترین زندگی کی قسم ضرور میونک آؤ۔ ضرور! ضرور!! ضرور!!!

تمہاری

اختر

اختر نے یہ خط دو تین مرتبہ پڑھا۔ کونے پر پنسل سے کتنی ساری آڑی
ترچھی لکیریں کھینچیں اور پھر اپنی جیب میں ڈال لیا۔ شفیع کو پڑھانے کی غرض
سے اختر یہ خط دو مرتبہ اس کے کمرے میں گیا لیکن ادھر ادھر کی باتیں کرنے
کے بعد یونہی واپس آ گیا۔ اس نے ایستھر کو ایک مختصر سا جواب لکھا کہ وہ
میونک ضرور آئے گا لیکن امتحان ختم ہو جانے کے بعد۔ اس کے ساتھ ہی
اس نے یہ بھی لکھ دیا کہ چونکہ اب وہ اپنے آپ کو کمرے میں بند کر کے امتحان
کی تیاری کرنے والا ہے۔ اس لئے وہ اس کے خطوں کے جواب تفصیل سے
نہ دے سکے گا۔ اور اگر کبھی اسے وقت پر جواب نہ ملے تو وہ گھبرائے
نہیں اور اپنے ساتھ ہی اسے بھی پریشان نہ کرے۔

یہ خط اس نے پوسٹ تو کر دیا لیکن تمام رات سوچتا رہا کہ پتہ نہیں
یہ خط پڑھ کر ایستھر کا ردّ عمل کیا ہو۔ شاید وہ جذبات کی رو میں بہہ کر خودکشی
کر لے یا خط پڑھ کر وہ پرزے پرزے کر ڈالے۔ مجھے بھلا دے اور جب میں
میونک پہنچوں تو مجھے پہچاننے سے بھی انکار کر دے۔ بہت ممکن ہے وہ خود

یہاں پہنچ جائے اور مجھے ساتھ لے کر کسی ایسے جزیرے میں چلی جائے جہاں سے کسی کو کسی کی خبر نہیں آتی۔ لیکن میں ایسا کمزور تو نہیں کہ چڑیا کی طرح مسحور ہو کر اجگر کے منہ میں چلا جاؤں۔ میری بھی تو انفرادیت ہے۔ میں بھی تو سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہوں۔ آخر میں کیوں بچے کی طرح انگلی پکڑ کر اس کے ساتھ چلا جاؤں گا۔ بھلا اس طرح کیسے ہوگا۔ میں اس کا ڈوگی تو نہیں ہوں!

اگلے دن صبح ہی صبح کسی نے اس کا دروازہ کھٹکھٹایا اور جب اس نے پٹ کھولا تو سٹیلا کا ہنستا ہوا چہرہ نمودار ہوا وہ ہاتھ میں پھٹے کی بنی ہوئی ایک چھوٹی سی ٹوکری اٹھائے کھڑی تھی۔ اور آج اس نے ہلکا سا میک اپ بھی نہیں کیا تھا۔ اختر اسے خوش آمدید کہتے ہوئے پیچھے ہٹ گیا اور جب وہ اندر آ کر کرسی پر بیٹھ گئی تو اس نے کہا۔

"کل سے تم مجھ سے ملنا بند کر دو گے۔ اور ہم ایک مہینے تک ایک دوسرے کی شکل نہ دیکھ سکیں گے۔ میں چاہتی ہوں کہ آج سارا دن ہم اکٹھے رہیں۔ میں تمہیں جی بھر کے دیکھوں اور اس کے بعد اپنے کالج سے ایک مہینے کی چھٹی لے کر گھر بیٹھ رہوں اور تم آخری پرچہ کر کے سیدھے میرے یہاں آؤ اور ہم وہ رات ٹیمز کے کنارے ادھر ادھر گھوم کر گزار دیں۔" پھر اس نے ٹوکری کی طرف اشارہ کر کے کہا: "اس میں لنچ کا سامان ہے۔ اور میں نے اپنے ہاتھ سے تمہارے لئے سینڈوچز تیار کئے ہیں۔ کیا تمہیں سینڈوچز پسند ہیں؟"

"کیوں نہیں۔" اختر نے چٹخارا بھر کے کہا: "مجھے تو یہ بہت ہی مرغوب ہیں۔ ہمارے یہاں انہیں شاہی ٹکڑے کہتے ہیں اور انہیں نمک کی چاشنی میں پکاتے ہیں۔"

"نمک کی چاشنی میں!" سٹیلا نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ہاں ہاں نمک کی چاشنی میں۔ وہ ایک خاص چیز ہوتی ہے۔ افسوس کہ لندن میں ایسی چاشنی تیار نہیں ہو سکتی کیونکہ اس کے لئے ہندوستان کی آب و ہوا کی ضرورت پڑتی ہے۔ تم ہندوستان آؤ گی تو کھلائیں گے۔"

سٹیلا نے آنکھیں بند کر لیں اور نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر سر پیچھے ڈال دیا۔ اختر سیٹی میں کامو کی دھن بجا کر کپڑے بدلنے لگا اور سٹیلا اسی طرح خاموشی سے کرسی میں دراز ہولے ہولے سانس لیتی رہی۔

جب وہ باہر نکلے تو زور کی بارش شروع ہو گئی اور سٹیشن تک پہنچتے پہنچتے ان کے سارے کپڑے بھیگ گئے۔ گاڑی میں سوار ہونے سے پہلے اختر نے اپنے رومال سے سٹیلا کے بازوؤں اور ہاتھوں کو خشک کیا اور جب اس نے نچوڑنے کی غرض سے رومال کو ایک بل دیا تو پہلا قطرہ گرنے سے پہلے اس نے بل کھول کر رومال کو جھٹکا اور اسے اپنی ناک کے قریب لا کر کہا۔

"دیکھو اس میں سے تمہاری خوشبو آنے لگی ہے۔ میں بھی کتنا بدنصیب ہوں تمہارے لمس کو اس سنگین پلیٹ فارم پر رولنے لگا تھا۔" سٹیلا نے مسکرا کر بھرپور نگاہوں سے اسے دیکھا اور نظریں نیچی کر لیں۔

تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد آج دن بھر بارش ہوتی رہی۔

گھرے بادلوں نے آسمان کو ڈھانک رکھا تھا اور سارے شہر پر رات کی سیاہی چھا رہی تھی، ٹریفک کے ہارن معمول سے زیادہ شور مچا رہے تھے۔ اور سڑکوں کی بتیاں روشن ہو گئی تھیں۔ اس تاریکی میں گاڑی بجلی کی طرح تڑپتی ونڈسر کی طرف بڑھ رہی تھی اور اختر اور سٹیلا ٹھنڈی نشستوں پر اجنبیوں کی طرح خاموش بیٹھے تھے۔ سٹیلا کے پاس ڈھیروں بے چین سوال تھے۔ اختر کے پاس بہت سے تسکین دہ جواب تھے لیکن موسم کی فوری تبدیلی نے انہیں سوگوار بنا دیا تھا۔ لوگوں کی گفتگو سے ظاہر ہوتا کہ مینہ ابھی نہیں تھمے گا اور مطلع کئی دن تک صاف نہ ہو گا۔ جہاز رانی سے دلچسپی رکھنے والے رود بار کے بارے میں باتیں کر رہے تھے جو ایسے موقعوں پر سفر کے قابل نہیں رہتی جہاں ان دنوں میں راہ نمائی کا کام بے حد مشکل ہو جاتا ہے۔ گاڑی کے لوگ آج معمول سے زیادہ باتیں کر رہے تھے۔ اور موسم کی ناخوشگواری کو اپنی گفتگو میں ڈبو کر ماحول سے بے خبر ہو جانے کی کوشش میں مصروف تھے۔ لیکن سٹیلا اپنے امڈتے ہوئے جذبات کو خاموشی کے دبیز پردوں تلے چھپا رہی تھی اور اسے اس طرح دیکھ کر اختر بھی چپ چاپ بیٹھا تھا۔ وقت گذرتا رہا۔ راستہ کٹتا رہا اور سکوت کے ابریشمی بادل ادھر ادھر پھیل کر ان کی نگاہیں دھندلاتے رہے۔ ونڈسر کہرے اور اندھیرے میں لپٹا ہوا تھا اور جب وہ قلعے کے مینار پر چڑھنے لگے تو پھر زور کی بارش شروع ہو گئی۔ سٹیلا اختر سے ایک زینہ آگے تھی۔ اور اپنے سکارف کو کندھوں پر ڈالے اس کے کونے مٹھی میں پکڑے ہوئے ہولے ہولے سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ اختر ٹفن دان ہاتھوں میں جھلاتے ہوئے اس کے پیچھے چلا آ رہا تھا۔ اوپر سے اترنے والوں

کی ہنسی اور سیٹیوں کی آواز سن کر وہ دیوار سے لگ جاتے اور جب پورا گروہ ان کے قریب سے گذر جاتا تو وہ پھر سیڑھیاں چڑھنی شروع کر دیتے۔ اوپر پہنچتے پہنچتے اندھیرا چھٹ گیا۔ لیکن بارش کی شدت میں اضافہ ہو گیا۔ سٹیلا نے اپنے سکارف کو اسی طرح پکڑے نیچے دیکھا۔ صحن میں مرد اور عورتیں بالشتیوں کی طرح ایک دوسرے کے پیچھے دوڑ رہے تھے اور چھینٹے ان کا تعاقب کر رہے تھے۔ اختر آلتی پالتی مار کر زمین پر بیٹھ گیا۔ سٹیلا نے پلٹ کر دیکھا اور کہا۔

"خدا اٹھو میں یہ سکارف بچھا دوں نہیں تو تمہاری پتلون خراب ہو جائے گی"

"کوئی بات نہیں"۔ اختر نے کہا "مجھے کریز ٹوٹی اور میلی پتلونیں ہی اچھی لگتی ہیں"

سٹیلا نے سکارف فرش پر پھینک دیا اور اس کے قریب بیٹھ گئی۔ اختر نے ٹفن دان کی طرف دیکھ کر کہا۔

"پتہ نہیں مجھے برکھا رت میں اتنی بھوک کیوں لگتی ہے۔ یہی جی چاہتا ہے کہ جو چیز سامنے آئے بنا دیکھے نگل جاؤں"

"تو میں ٹفن دان کھولوں؟" سٹیلا نے پوچھا۔

"ہاں ہاں"۔ اختر نے آنکھیں گھما کر کہا "اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے"

ایک ڈبہ سینڈوچز سے بھرا ہوا تھا۔ دوسرے میں سیب کے ٹکڑے اور چاکلیٹ کی ٹکیاں۔ اختر نے ایک سینڈوچ اٹھا کر اس کا منہ ذرا سا کھولا اور پوچھا

"یہ کس چیز کا سینڈوچ ہے؟"

"سؤر کا" سٹیلا نے بھولپن سے کہا۔

اختر ہنسا اور سینڈوچ کے دونوں پرت علیحدہ کر دیئے۔ مکھن میں
چڑی خاکستری گوشت کی پتلی سی گلوبی تہہ کا ایک کونہ ٹوٹ کر اوپر کے پرت سے
چمٹ گیا۔ اور باقی بچنے ٹکڑے سے اسی طرح لگی رہی۔ اختر نے دونوں ٹکڑے
اپنی ہتھیلیوں پر رکھ کر ہاتھ پھیلا دیئے اور مسکرا کر پوچھنے لگا۔

"تمہیں معلوم نہیں کہ ہم لوگ سؤر کا گوشت نہیں کھاتے۔"

سٹیلا حیرانی سے اس کا منہ تکنے لگی اور اثبات میں سر ہلا کر بولی۔

"میں نے پڑھا ہے کہ مسلمان سؤر کا گوشت نہیں کھاتے لیکن میرا خیال تھا کہ وہ ترقی یافتہ مسلمان جو بلا جھجک شراب پیتے ہیں۔ شاید سؤر کا گوشت بھی کھاتے لگے ہوں۔"

"ہرگز نہیں"۔ اختر نے دعوے سے کہا۔ "ازل کا شرابی مسلمان بھی اس ناپاک چیز کو ہاتھ نہیں لگاتا۔"

"مجھے بڑا افسوس ہے"۔ سٹیلا نے لجاجت سے کہا۔ "اگر میں جانتی تو ایسے سینڈوچ ہرگز نہ بناتی۔ لیکن اب تم کیا کھاؤ گے؟"

اختر نے گوشت کی تہ کو پرت سے چھڑاتے ہوئے کہا۔ "میں گوشت اتار کر انہیں مکھن توس سمجھ کر کھا لوں گا۔"

"نہ! نہ!" سٹیلا نے اپنے ابرو ذرا سے سکیڑ کر کہا۔ "یہ بہت بری بات ہے تمہارے مذہب کی رو سے تو ڈبل روٹی کا یہ ٹکڑا بھی ویسا ہی ناپاک ہو گیا ہے۔"

"کوئی بات نہیں"۔ اختر نے ہنستے ہوئے کہا۔ "میں ایسا کٹر نہیں۔"

سٹیلا نے اس کی کلائی پکڑ لی اور پیار سے بولی۔ "تم کٹر نہیں ہو تو نہ سہی لیکن میں اس معاملے میں بہت قدامت پسند ہوں۔ میں تمہیں یہ ٹکڑے ہرگز نہ کھانے دوں گی۔"

"خواہ مجھے زور کی بھوک لگی ہو۔"

"ہاں۔"

"اور خواہ میں بھوک سے مر جاؤں؟"

"ہاں۔"

"تو تمہاری مرضی"۔ اختر نے دونوں ٹکڑے ڈبے میں ڈال دیئے اور سیب کا ایک ٹکڑا اٹھا کر چبانے لگا۔ سٹیلا نے پنیر کے ایک ٹکڑے کو کتر کتر کر کھانا شروع کر دیا۔ اور سینڈوچز کے ڈبے کو پرے دھکیل دیا۔

اختر نے کہا۔ "مجھے تو بھوکوں مارا ہے اب خود بھی سینڈوچز نہیں کھاتی ہو۔"

"نہیں کھاؤں گی"۔ سٹیلا نے بچوں کی طرح منہ چلاتے ہوئے کہا۔

"کیوں۔"

"میری مرضی۔"

"لیکن اس کا کوئی سبب بھی ہو۔"

"ہے ایک۔"

"کیا؟ آخر مجھے بھی تو معلوم ہو۔"

"ہمارے مذہب میں بھی یہ چیز حرام ہے۔"

"وہ کب سے؟"

"آج سے۔" سٹیلا نے منہ پکا کر کے کہا: "ابھی ابھی وحی اتری ہے۔"

اس پر دونوں ہنسنے لگے۔

بارش اسی طرح ہو رہی تھی اور مینار کی سیر کرنے والے ڈیوڑھی میں رکے ہوئے تھے۔ یخ ہوا مینار کی چوٹی سے رگڑ کھا کر سیٹیاں بجانے لگی تھی اور دور دور کے چھینٹے لپک لپک کر اندر آ رہے تھے۔ سٹیلا نے سمٹ کر کہا۔

"کس قدر خراب موسم ہے۔ مجھے ایسی رات میں خواہ مخواہ کوفت ہونے لگتی ہے۔ گو مجھے لندن میں رہتے کافی عرصہ ہو گیا ہے لیکن میں یہاں کے موسم سے مانوس نہیں ہوئی اور ایسے ہی ہر گھڑی مجھے یہی احساس ہوتا رہتا ہے کہ میں اس سرزمین میں ایک نووارد ہوں۔"

اختر نے کہا: "ہمارے دیس میں لوگ ایسے موسم کے لئے ترستے رہتے ہیں۔ گیت گا گا کر اور دعائیں مانگ مانگ کر وہ قدرت سے ایسے موسم کو طلب کرتے ہیں اور جب آسمان پر گھنگھور گھٹائیں چھا جاتی ہیں اور بگلوں اور کونجوں کی سفید سفید قطاریں وائلن کے مدھم سر بجاتیں، دھواں دھار فضاؤں سے گزرتی ہیں تو ہمارے دیس کی لڑکیاں جھولا جھولتی ہیں۔ پینگیں بڑھاتی ہیں اور ملہاریں گاتی ہیں۔ کسان لوگ گیتوں کی تانیں اڑاتے ہیں اور لڑکے بالے میدانوں میں نکل کر طرح طرح کے کھیل کھیلنے لگتے ہیں۔"

"تو مجھے اس دیس میں لے چلو۔" سٹیلا نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا "مجھے یہ دیس ذرا بھی پسند نہیں۔ مجھے اس ملک کی کوئی چیز بھی اچھی نہیں لگتی۔

میں تمہارے وطن میں زندگی گذارنا چاہتی ہوں۔ اور تمہارے ملک میں دفن ہونا پسند کرتی ہوں۔ مجھے وہاں لے چلو۔ اس کے بعد میں تم سے کوئی فرمائش نہ کروں گی۔ خدا کے لئے مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔"

اختر نے کہا: "وہاں جا کر کیا کرو گی تمہیں وہ ملک پسند نہ آئے گا تم تھوڑے ہی عرصے میں گھبرا جاؤں گی اور پھر ولایت آنے کے لئے ترسنے لگو گی۔"

اختر فرش پر لیٹ گیا اور اپنا سر سٹیلا کی گود میں رکھ دیا وہ چاکلیٹ کی ایک چھوٹی سی ٹکیا کو انگلیوں میں گھما رہا تھا اور کہہ رہا تھا: "جس طرح مشرق کے رہنے والوں کو مغرب پسند نہیں آتا اسی طرح تم کو بھی مشرق راس نہ آئیگا۔ ہم لوگ تمہیں اچھے نہ لگیں گے ہمارے رسم و رواج تمہاری نظروں میں نہ جچیں گے اور تم پریشان ہو جاؤ گی۔ جیسے ہم تمہارے دیس کے لئے پیدا نہیں ہوئے تم بھی ہمارے ملک کے لئے وجود میں نہیں آئی ہو۔"

سٹیلا نے اپنی کہنیاں فرش پر جما کر سر پیچھے ڈال دیا اور کہا۔

"میں نے مغرب میں جنم ضرور لیا ہے۔ لیکن طبعاً میں مشرقی ہوں۔ میرا وجود لندن میں رہتا ہے لیکن میرا جی ہندوستان میں بستا ہے۔ اور میں اپنے ذہن اور وجود کے درمیان خارجی حالات کو اور زیادہ دیر تک حائل دیکھنا پسند نہیں کرتی۔ مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔ میں کبھی شکایت نہ کروں گی۔ تم میرے ساتھ رہو گے تو میں کچے گھر میں رہ لوں گی۔ برتن صاف کیا کروں گی۔ کھانا پکاؤں گی کپڑے دھویا کروں گی اور میں تمہیں یقین دلاتی ہوں اختر کہ میں بہت جلد اردو سیکھ

وں گی اور چند ہی دنوں میں تمہاری معاشرت سے مانوس ہو جاؤں گی اور اگر مجبوراً ہمیں تمہارے رشتہ داروں سے دور جا کر دیہاتی زندگی بھی بسر کرنی پڑے تو مجھے فصل بونے چارہ کاٹنے اور نلائی کرنے سے بھی عار نہ ہوگی۔ میں صبح اٹھ کر گائیں دوہا کروں گی۔ مرغیوں کو دانہ ڈالا کروں گی اور اپنے ہاتھوں سے چھاچھ بلو کر مکھن نکالا کروں گی۔ بہت ممکن ہے کبھی جاگتے میں مجھے اپنے پیرس کے اپنی درسگاہوں کے اپنی سہیلیوں کے خواب دکھائی دے جائیں لیکن یں وعدہ کرتی ہوں کہ ان سے متعلق تم میری زبان سے ایک فقرہ بھی نہ ن پاؤ گے۔ اور مجھے اپنے آپ پر پورا بھروسہ ہے۔ بوبو مجھے ساتھ لے جاؤ گے۔ اپنے ساتھ رکھو گے۔ اپنے دیس میں مرنے دو گے؟ بولو اختر!"

بارش ہوتی رہی۔ اندھیرا ٹمٹماتا رہا، پھیلتا رہا اور تاج خاندان کا ی۔ سی۔ ایس ہونے والا نونہال زرخیز کھیتوں اور ناگوری بیلوں کے بارے یں سوچتا رہا۔ گائیں ڈکرا رہی تھیں۔ بادل گرج رہا تھا۔ ریوڑ کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ چرواہے گاتے چلے آ رہے تھے۔ کلیسا کی محرابوں میں کانسی کی گونج وب رہی تھی اور حمد کے دھیمے دھیمے سُر بلند ہو رہے تھے۔ یوروشلم کے گڈریئے کے سامنے یورپ گھٹنے ٹیک کر اس کے گن گائے جاتا تھا۔

اختر کا کمرہ بند ہو گیا تھا اور اس نے ہر ایک سے ملنا ترک کر دیا تھا

شفیع کو اس کے کمرے میں دن میں ایک بار آنے کی اجازت تھی۔ اور وہ بھی پندرہ منٹ کے لئے گلیکسو بسکٹ کے بہت سے ڈبے پلنگ کے نیچے رکھ لئے گئے تھے۔ اور گاڑھے دودھ کا ایک ڈبہ تھوڑا سا کھول کر میز پر ڈال لیا گیا تھا۔ رات کا کھانا موقوف ہو گیا اور دن کے وقت ناشتے کے بجائے سوکھے بسکٹ چبائے جاتے اور گاڑھے دودھ کو شہد کی طرح چاٹا جاتا۔ پڑھتے پڑھتے اختر کو اگر کبھی شدت کی بھوک محسوس ہوتی تو وہ پلنگ کے نیچے ہاتھ ڈال کر ایک بسکٹ نکالتا اور تکیہ کا سہارا لئے کتاب پر نگاہیں جمائے بسکٹ کرکنے لگتا

اس نظر بندی کے چوتھے دن دوپہر کے وقت اختر کو ایستھر کا تار ملا۔

"آخر تم آتے ہو کہ نہیں؟"

اختر نے شفیع کو یہ بتائے بغیر تار گھر جا کر ایستھر کو ایکسپریس ٹیلیگرام بھیج دیا۔

"ابھی نہیں آ سکتا۔ تیس دن اور انتظار کرو۔"

شفیع نے اختر کی اس جرأت پر خوش ہو کر اسے گلے سے لگا لیا۔ اور پیٹھ ٹھونک کر کہا۔

"شاباش بیٹا دنیا میں ایک کام تو کیا ہم تم سے بہت خوش ہیں۔ بولو کیا مانگتے ہو؟"

اختر نے سیس نوا کر کہا "گرو جی! آپ کی اور پرماتما کی دیا سے بڑے آنند سے ہوں۔ اس کے کوئی اچھیا من میں نہیں جب ہو گی بنتی کروں گا"

اختر پرنام کر کے اپنے کمرے میں آ گیا۔

تکیے کا سہارا لئے کتاب پر نگاہیں گاڑے اختر جب ایک فقرے
سے دوسرے کی طرف بڑھتا تو وہ بھی ایستھر کے تار کا مضمون بن جاتا —
سگرٹوں کی ڈبیا ختم ہو گئی۔ گلیکسو بسکٹ ایک ایک کر کے ٹھکانے لگ گئے۔
کتابوں پر کتابیں بدل گئیں۔ لیکن ان کے نفس مضمون میں تبدیلی نہ ہوئی۔ تاریخ
فلسفہ، فارسی، انگریزی ہر کتاب سمٹ کر ایک فقرے میں محدود ہو گئی۔

"آخر تم آتے ہو کہ نہیں؟"

اس نے پھر کپڑے تبدیل کئے۔ ایستھر کے تار کو جیب میں رکھا
اپنے تار کی رسید پھاڑ دی اور ٹیکسی لے کر تھامس کک پہنچ گیا اور اگلے دوپہر
کے طیارے سے میونک کے لئے ایک سیٹ مل گئی۔

اگلے دن اختر اور شفیع لندن ایڈورڈ روم کے رسیتوران میں چائے
ی رہے تھے تو اختر نے اپنا سگریٹ ایش ٹرے میں رکھ کر ہاتھ جوڑ کے کہا۔

"گرو جی! بڑا کشٹ مجھ پر آیا ہے۔ میری سہایتا کیجئے۔ آپ نے وچن
یا تھا پورا کیجئے۔"

شفیع نے جل کر کہا، "بکواس نہ کر سیدھی طرح بتا۔"

اختر نے ہوائی سفر کا تھیلا کھولا اور اپنا پیڈ نکال کر کاغذوں کے
نیچے اپنے دستخط کرتے ہوئے کہا۔

"یار اگر گھر سے میرے نام کوئی خط آئے تو ان پر اس کا جواب لکھ
ینا کہ اختر چونکہ پڑھائی میں مصروف ہے اس لئے خطوط نویسی میں وقت
ائع کرنا نہیں چاہتا۔"

"اور اگر سعیدہ لکھے کہ جواب مختصر دو لیکن اپنے ہاتھ سے دو تو
میں کیا لکھوں؟"

"وہ کبھی بھی ایسے نہیں لکھے گی"۔ اختر نے قلم روک کر کہا۔ "یار وہ بڑی
بھولی ہے۔ اسے تو بس میری خیریت ہی مطلوب ہوتی ہے۔ خواہ وہ تمہاری
وساطت سے معلوم ہو یا اخبار سے یا میرے اپنے خط سے۔"

"فرض کرو وہ نہ مانے۔" شفیع نے پوچھا۔

"تو تم جواب نہ دینا۔" اختر نے دستخط کرتے ہوئے کہا۔ "خط رکھ
چھوڑنا میں آکر خود جواب لکھ دوں گا۔"

شفیع نے پیڈ لے کر دو تین صفحوں کو دیکھا اور نظریں اٹھائے بغیر
پوچھا۔ "اور مجھے تو لکھتے رہو گے نا؟"

"کمال کرتے ہو یار۔" اختر نے ہنس کر کہا۔ "میں لام پر تو نہیں جا رہا
چاچا ایک ہفتے میں لوٹ آؤں گا۔"

شفیع خاموش ہو گیا اور دونوں چائے پینے لگے۔

۴

ٹیکسی ٹڈرشنک سٹراسے پر جاکر رُکی۔ سڑک سے دو سیڑھیاں اونچی ایک پرانی وضع کی حویلی ایستادہ تھی۔ اختر نے انگلی کے اشارے سے پوچھا کہ یہی وہ مقام ہے تو ڈرائیور نے کرخت زبان کو نرم لہجے میں ادا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے سر کے اشارے سے کہا ہاں یہی ہے۔ اختر نے برآمدے میں داخل ہوکر فرش کی گھسی ہوئی سلوں کو دیکھا اور گھنٹی تلاش کرنے لگا۔ بغلی کمرے کے باہر ایستھر کے نام کی ایک چھوٹی سی تختی لٹک رہی تھی۔ اس نے دستک دیئے بغیر دروازے کو آہستہ سے کھولا اور گربہ پائی سے اندر داخل ہوگیا۔ ایستھر جمائی لے کر بستر سے اُٹھی اور آنکھیں کھولے بغیر اپنا ہاتھ بڑھا کر بولی: "اختر"

اختر نے لپک کر ایستھر کو اپنے بازوؤں میں لے لیا اور اس کے لبوں کو بوسہ دے کر کہا۔

"ٹیکسی باہر کھڑی ہے۔ اور میرا سامان بھی اسی میں ہے"۔ ایستھر

سلیپر پہن کر کھڑی ہوگئی۔ اور بالوں کا جوڑا بناتے ہوئے باہر آگئی۔ ٹیکسی ڈرائیور نے بڑے ادب سے اسے سلام کیا اور سامان باہر نکالنے لگا۔ اٹیچی کیس اٹھاتے ہوئے اس نے اختر سے کہا۔

"دیکھتے کیا ہو اپنا بکس اٹھاؤ۔ یہ لندن نہیں میونک ہے، اور یہاں پورٹر نہیں ہوتے"۔

اختر نے بیگ کندھے سے لٹکایا اور بکس اٹھا کر اس کے پیچھے چلنے لگا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہوتے ایستھر نے کہا۔

"تم نے تار دے کر خواہ مخواہ پیسے ضائع کئے۔ مجھے معلوم تھا کہ تم آرہے ہو۔ اور تمہیں معلوم تھا کہ تم رہ نہیں سکو گے تو پھر تم نے تار کیوں دیا"۔

"کیا بات ہے" اختر نے بیگ اتارتے ہوئے کہا۔ "چھوٹتے ہی اولیاؤں والی باتیں شروع کردیں۔ شکر ہے کوئی پیغمبر جرمنی میں پیدا نہیں ہوا ورنہ خدا جانے تم اور کس قسم کے دعوے کرتیں"۔

ایستھر مسکراتے ہوئے پلنگ پر بیٹھ گئی اور اپنا جوڑا کھول کر پھر باندھنے لگی۔

اختر نے کہا: "کیوں تکلف کرتی ہو۔ بال لمبے نہیں تو کیوں خواہ مخواہ بل دیئے جاتی ہو ہندوستانی لڑکی بننا کچھ ایسا آسان بھی نہیں"۔

ایستھر نے اسی طرح بل دیتے ہوئے پوچھا: "راستے میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟"

"کوئی خاص نہیں۔"

"اور ہمارا گھر آسانی سے مل گیا تھا؟"

"ہاں تمہارا گھر تو آسانی سے مل گیا تھا۔ لیکن۔۔۔۔۔۔"

"لیکن کیا؟"

"لیکن تم آسانی سے نہیں ملیں۔"

"کیوں؟"

"کیوں کیا۔" اختر نے انداز محبوبی سے کہا۔ "میں کتنی دیر تمہارے
نگ کے پاس کھڑا یہ سوچتا رہا کہ تمہیں جگاؤں یا سونے دوں۔"

"ہومت۔" ایستھر نے مسکرا کر کہا۔ "مجھے تم کیا جگاؤ گے۔"

اختر نے پوچھا۔ "لیکن تم یہ سر شام سو کیوں گئیں۔"

"بس یونہی۔" ایستھر نے پوری آنکھیں کھول کر جواب دیا۔
مجھے نیند آ رہی تھی میں سو گئی۔"

اختر نے کہا۔ "میری جان تم تو مزے سے سویا کرتی ہو اور ہم
ت رات بھر انگاروں پر لوٹا کرتے ہیں۔"

"شاباش۔" ایستھر نے سنجیدگی سے کہا۔ "تم بڑے فرمانبردار
و۔ اچھا اب تمہیں اپنی امی اور خالہ سے ملاؤں۔"

ایک بڑے کمرے میں ایستھر کی ماں اور اس کی خالہ شطرنج
یل رہی تھیں۔ اور ان کے پاس ایک السیشن کتا اگلی ٹانگوں پہ
تھوتھنی رکھے آنکھیں بند کئے پڑا تھا۔ قدموں کی چاپ سن کر اس

نے آنکھیں کھولیں اور ایستھر کے ساتھ ایک اجنبی کو داخل ہوتے دیکھ کر تن کر
کھڑا ہو گیا۔ ایستھر نے جرمنی میں اسے کچھ کہا اور وہ دم ہلاتا ہوا ان کے پاس
آ گیا۔ ایستھر کی آواز سن کر شطرنج کھیلتی ہوئی عورتوں نے گردنیں موڑ کر ا
دیکھا اور بساط چھوڑ کر کھڑی ہو گئیں۔ ایستھر نے مسکراتے ہوئے اپنی زبان میں
اختر کا تعارف ان سے کرایا اور جب اختر نے جھک کر انہیں سلام کیا تو خا
نے ایستھر کو مخاطب کر کے کچھ کہا۔ ایستھر نے ہنستے ہوئے اختر سے کہا۔

"میری خالہ کہہ رہی ہیں کہ ان کا تصور تمہارے متعلق بڑا عجیب
سا تھا کہ سر پر ایک بڑا سا پگڑ باندھے۔ زمرد کی کلغی لگائے بڑی بڑی مونچھ
والا ایک سیاہ فام آدمی اندر داخل ہو گا جس کے پیچھے ڈفلیاں بجانے وال
لڑکیاں ہوں گی اور چیتے کی کھالیں بغل میں دبائے بہت سے یوگی اور گر
ہوں گے اور وہ پرنام کرتا منتر جپتا ایک کونے میں آسن جما کر بیٹھ جائے گا۔"

اختر نے جواب دیا۔ "پتہ نہیں ہندوستانیوں کی بود و باش کے متعلق
تم لوگوں کے شکوک کب رفع ہوں گے۔ ہم بھی تو تمہاری طرح کے انسان
ہیں اور بقول ہٹلر تم بھی تو آرین ہو۔"

ایستھر نے بھنویں سکیڑ کر کہا۔ "اس منحوس کا نام نہ لو۔ مجھے وہ زہر
لگتا ہے۔"

"اس لئے کہ اس نے قیصر کے مداحوں کی جاگیریں ضبط کر لی ہیں"
اختر نے پوچھا۔

"صرف اس لئے نہیں۔ بلکہ اس کی اور بھی بہت سی وجوہ ہیں۔"

اختر ہنس پڑا اور سر ہلا کر کہنے لگا: "چاہے کچھ بھی سمجھو لیکن اس سے
فرت کرنے کی صرف یہی وجہ ہے کہ ہٹلر کے دورِ حکومت میں تمہارے کھیت بحق نازی
سرکار ضبط ہو چکے ہیں اور ...."
"چلو یہ ہی سہی" ایستھر نے چڑ کر کہا "لیکن تم کیا اس کے سگے ہو جو
ی ہمدردی جتا رہے ہو"
اختر نے کہا: "افسوس تو یہی ہے کہ میں ہٹلر کا سگا نہیں۔ ورنہ اس
شان میں ایسی گستاخی کا ہرگز متحمل نہ ہوتا"
ہٹلر کا لفظ سن کر دونوں عورتیں غور سے ان کی گفتگو سننے لگی
یں اور جب اختر نے دوبارہ اس کا نام لیا تو ایستھر کی ماں نے اپنی بیٹی
سے جرمنی میں سوال کیا جس کا مختصر سا جواب دے کر ایستھر نے اختر
سے کہا۔

"چلو اوپر تمہیں تمہارا کمرہ دکھا دوں"
سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اختر نے پوچھا: "تمہاری امی کیا کہہ رہی تھیں"
"کچھ بھی نہیں" ایستھر نے جواب دیا۔
"ضرور کچھ ہے" اختر نے کہا "بات کرتے ہوئے ان کے تیور کڑے
تے تھے"

ایستھر نے کہا: "ایمان سے تمہارے متعلق نہیں پوچھ رہی تھیں"
"کوئی بات نہیں" اختر بولا "ہم بھی جلد ہی یہ آخ ناخ خر خشک
سیکھ لیں گے"

کمرے میں داخل ہو کر ایستھر نے مدھم سا بلب روشن کر دیا اور پلنگ
کی طرف اشارہ کر کے بولی۔
"آج کی رات یہ پلنگ تمہارا ہے اور اس کمرے کی ہر چیز تمہاری ہے"
"اور کل؟" اختر نے پوچھا۔
"کل میں تمہارے لئے کہیں بندوبست کر دوں گی" ایستھر نے اس
کی طرف گھوم کر کہا "امید ہے اکیڈیمی میں تمہیں ایک کمرہ مل جائے گا"
"تو گویا میں تمہارے ساتھ یہاں نہیں رہوں گا"
"یہ کیوں کر ہو سکتا ہے" ایستھر نے سر ہلایا "ہمارے یہاں یہ رواج
نہیں۔ مہمان یا تو ہوٹل میں ٹھہرتے ہیں یا نہیں ...."
"بڑے بے مروت لوگ ہو تم" اختر نے رنجیدہ ہو کر کہا "دور دراز
کے مہمانوں سے بھی یہ سلوک کرتے ہو تو اچھا نہیں کرتے"
ایستھر نے کوئی جواب نہ دیا اور بستر ٹھیک کرنے لگی۔
یہ پرانی وضع کا ایک لمبا سا کمرہ تھا جس کی اونچی کھڑکیاں باہر سڑک
کی طرف کھلتی تھیں۔ اور ان کی چوکھٹوں پر پیتل منڈھا ہوا تھا۔ اندر کمرے کی
دیواروں سے بھاری بھاری زرہیں لٹک رہی تھیں اور لکڑی کے کارنسوں پر
زنگ آلود خود پڑے تھے۔ کھڑکیوں کے درمیان ایستھر کے آب و جد کی قدآدم
روغنی تصویریں آویزاں تھیں۔ جن کا روغن جگہ جگہ سے اکھڑ گیا تھا اور خدوخال
دھندلے پڑ گئے تھے۔ ان تصویروں کے دائیں بائیں قدیم طرز کی دودھاری تلوار
لٹک رہی تھیں۔ جنہوں نے قیصر کی حمایت میں لاکھوں انسانوں کے کلیجے چاٹے

تھے۔ اور ہزاروں کا خون پیا تھا اور اب سالہا سال سے بیکار پڑی تھیں۔ ایستھر نے ایک آبنوسی الماری کا پٹ کھولا اور پلٹ کر کہا۔

"میں نے تمہارے لئے موم بتیوں کا ایک بنڈل منگوا رکھا ہے۔ تم کمرے میں موم بتی جلا کر سونے کے عادی ہو نا؟"

"ہوں"۔ اختر نے آہستہ سے کہا اور ہولے ہولے قدم اٹھاتے ہوئے اس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ ایستھر نے بنڈل آگے بڑھاتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا اور اختر بے اختیار اس سے لپٹ گیا۔ ایستھر کا سر پیچھے جھک گیا۔ اس کے بازو ڈھیلے ہو کر ٹوٹی ہوئی ڈالیوں کی طرح لٹک گئے ہاتھ کی گرفت ماند پڑتی گئی اور موم بتیوں کا بنڈل فرش پر گر پڑا۔ وہ آہستہ آہستہ کہہ رہی تھی۔

"میں نے تمہارا کتنا انتظار کیا۔ کتنی مرتبہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر میں اپنی کھڑکی سے تمہاری راہ تکتی رہی مگر تم نہ آئے۔ بے وفا محبوب کی طرح مجھے ستاتے رہے۔ بھیانک خوابوں کی طرح مجھے بے چین کرتے رہے۔ ہر گھڑی مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ تم سائیکل پر سوار ہو کر ہمارے یہاں آئے ہو اور ایک پاؤں ہماری سیڑھیوں پر رکھ کر سائیکل پہ بیٹھے بیٹھے گھنٹی بجا رہے ہو۔ میں دبے پاؤں کمرے سے باہر نکلتی لیکن سیڑھیوں کے پاس کوئی بھی نہ ہوتا اور گھنٹی اسی طرح بجتی رہتی بتاؤ تم سچ مچ کیوں نہ آئے۔ میرے بلائے بغیر کیوں نہ چلے؟" پھر اچانک اس کا لہجہ بدل گیا اور اس نے اختر کے بازو اپنی انگلیوں میں جکڑ کر کہا "لیکن تم کیوں آئے میں نے کہا تھا کہ اگر بلاؤں تو بھی نہ آنا۔ اگر میں لکھوں تو بھی نہ چلنا۔ پر تم

نے میری بات نہ مانی۔ جتنے اچھے تم مجھے لگتے ہو اگر اتنی ہی اچھی تمہیں میں بھی لگتی تو تم کبھی میری بات نہ ٹالتے۔ کبھی یہاں نہ آتے۔ لیکن میں تمہیں اچھی نہیں لگتی۔ تمہیں مجھ سے پیار نہیں۔ ایستھر سے تمہیں محبت نہیں۔ تمہیں تو اپنے آپ سے پیار ہے۔ اور تم اپنے آپ سے ملنے یہاں آئے ہو" پھر اس نے اختر کو پرے دھکیلتے ہوئے کہا "جاؤ یہاں سے جلد چلے جاؤ۔ میرا دیس چھوڑ دو، میرا نگر چھوڑ دو۔ مجھے چھوڑ دو۔ خدا کے لئے اختر آج ہی یہاں سے چلے جاؤ۔ ابھی چلے جاؤ۔ اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو یہ گھر روحوں کی آماجگاہ بن جائے گا۔ بھوتوں کا مسکن بن جائے گا اور لوگ اس آسیب زدہ مکان کے قریب سے بھی نہ گذرا کریں گے۔"

اختر نے اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا اور اس کا شانہ تھپکنے لگا۔

اگلے دن اختر کو بنک سے ملحقہ ایک عمارت میں کمرہ دلوا دیا گیا۔ اور وہ اپنی چند کتابوں سمیت اس کمرے میں براجمان ہو گیا۔ دو بجے تک ایستھر اکیڈیمی میں رہتی اس کے بعد سیدھی اس کے یہاں آتی۔ شام کی چائے اور کھانا اختر ان کے یہاں کھاتا اور پھر اپنے کمرے میں آ کر سو رہتا۔ دو چار دن تک تو اختر اپنی کتابیں پڑھتا رہا لیکن اس کے بعد اس نے جرمن زبان سیکھنی شروع کر دی۔ اور بلا ناغہ ایستھر سے سبق لینے لگا۔ شام کو چار بجے چائے سے فارغ ہو کر ایستھر کی ماں اور خالہ بساط لے کر بیٹھ جاتیں اور اختر باری باری ان کے ساتھ شطرنج کی بازیاں کھیلتا رہتا۔ ایک آدھ گھنٹہ ایستھر بھی ان کے پاس بیٹھتی لیکن پھر ناک بھوں چڑھا کر اپنے کمرے میں چلی آتی اور اندر

ے دروازہ بند کر کے شام کے کھانے تک وہیں بند رہتی۔ گونگے اور بہرے
کھلاڑیوں کی یہ چوکڑی شطرنج میں کچھ اس طرح مصروف ہو جاتی کہ انہیں
نیا و مافیہا کی خبر نہ رہتی۔ جیسے کہ ملازمہ گھنٹی بجاتی اور وہ مہروں کی ترتیب
نگاہوں میں بھانپ کر کھانے کے کمرے میں چلے آتے۔ ایستھر منہ پھلائے
ہونٹ لٹکائے کھانے کی پلیٹیں ادھر ادھر سرکاتی رہتی اور جب اختر اس
ے کوئی سوال کرتا تو وہ بڑے تحمل سے کہتی۔

”تم شطرنج کھیلے جاؤ۔ مات دو اور مات کھاؤ۔ تمہیں ان باتوں سے
طلب۔“ اور وہ چپکا ہو جاتا۔ اختر نے دراصل بڑی بوڑھیوں کی حمایت
ل کرنے اور ان پر اچھا اثر چھوڑنے کے لئے شطرنج شروع کی تھی ورنہ اسے
کھیل سے کچھ ایسی دلچسپی نہ تھی۔ چال چلتے ہوئے وہ ہمیشہ ایستھر کے
علق سوچا کرتا کہ اب اس نے کتاب اٹھائی ہو گی ورق پلٹتا ہو گا۔ بلاٹنگ
پر پنسل سے ایک منی سی تصویر بنائی ہو گی اور اب اپنا جوڑا پھر باندھا ہو گا۔
سوچتے ہوئے وہ فیل اٹھا کر گھوڑے کی چال چل دیتا جس پر ایستھر کی
ں یا خالہ اس کا ہاتھ پکڑ کر ٹوک دیتیں لیکن یہ کھیل بہت جلد ختم ہو گیا جب
ے دن ہزار تلاش کے باوجود مہروں کا ڈبہ اور بساط کہیں نہ مل سکی۔ اس دن
ر بڑی دیر تک ایستھر سے باتیں کرتا رہا اور اگلے دن کا سبق بھی وہیں لے
۔ دوسرے روز دوپہر کو اکیڈمی سے لوٹتے ہوئے جب ایستھر اس سے
تو ہنس کر پوچھنے لگی۔

”میری جان آج شطرنج کی بازی نہیں ہو گی؟“

اختر نے منہ لٹکا کر کہا۔ ”بساط اور مہرے ہی گم ہو گئے کھیلیں کیسے
—— نئی بساط آئے گی تو دیکھا جائے گا۔“

ایستھر نے تنک کر کہا۔ ”آنے دو نئی بساط۔ وہ بھی کیا بھٹی میں جھونکی
جائے گی۔“

”بھٹی میں؟“ اختر نے حیران ہو کر کہا۔

”ہاں۔“ ایستھر نے جواب دیا۔ ”تمہاری پہلی بساط اور مہرے میں نے
ہی کچن کی بھٹی میں ڈالے تھے اور آئندہ جتنی بساطیں آئیں گی ان کا حشر
بھی یہی ہو گا۔“

اختر نے اس کے گلے میں باہیں ڈال کر کہا۔ ”تمہیں میرا کھیلنا
برا لگتا ہے؟“

”سخت برا۔“ ایستھر نے آنکھیں چمکا کر کہا۔ ”تمہیں گھنٹوں کھیل میں
مصروف دیکھ کر میرا جی چاہتا ہے کہ تمہیں گولی مار دوں۔“

اختر نے مسکرا کر پوچھا ”پھر گولی ماری کیوں نہ؟“

”گولی!“ ایستھر نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا۔ ”تمہیں
تو پھول بھی نہیں مارا جا سکتا میرے چاند۔“

اس دوپہر کو انہوں نے گھر ٹیلیفون کر دیا کہ آج چونکہ ہم پکچر دیکھنے
جا رہے ہیں اس لئے شام کی چائے پر ہمارا انتظار نہ کیا جائے لیکن پکچر جانے
کے بجائے ایستھر اسے اینگشٹے گارڈن لے گئی۔ میونک کے چاروں طرف
چکر کاٹتا ہوا یہ باغ مالٹے سنگترے اور گریپ فروٹ کے پودوں سے پٹا

تھا۔ پودوں کے درمیان مخملی گھاس کی کشادہ شاہراہ باغ کے بیچوں بیچ چل رہی تھی
ور اس کا سلسلہ کہیں ختم نہ ہوتا تھا۔ سرو کے مخروطی پیڑوں نے چھوٹی چھوٹی جھیلوں
کو گھیر رکھا تھا جن میں پرپیچ بطیں سفید راج ہنس اور سیاہ بطخیں تیر رہی تھیں۔
یستھر نے اختر کے بازو کا سہارا لے کر پوچھا۔

"تمہیں یہ باغ پسند ہے؟"

"بہت"۔ اختر نے اس کی طرف جھک کر کہا۔

"تو آؤ تھوڑی دیر کے لئے اس جھیل کے کنارے بیٹھیں اور ان جانوروں
کا نظارہ کریں"۔

راج ہنس پانی میں اپنی گردن ڈبو کر خوراک تلاش کر رہے تھے اور ان
کے سفید سفید دھڑ کنول کے ادھ کھلے پھولوں کی طرح ادھر ادھر تیر رہے تھے۔ سیاہ
بطخیں گردنوں کے پھن اٹھائے شفاف پانی پر پیرتے ہوئے مدھم مدھم لہریں پیدا
کر رہی تھیں۔ اور بطیں ان دو انسانوں کو کنارے پر اس طرح بیٹھے دیکھ کر اگلی
جانب کھسک گئی تھیں۔ ایستھر بظاہر جھیل کی طرف دیکھ رہی تھی۔ لیکن اس
کی نگاہیں تخیل کی چناروں بھری وادی سے پار ہو کر ایسے مقام پر پہنچ گئی تھیں جہاں
کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ اختر پتلی پتلی گھاس کے تین ستواں پودوں کو اکھاڑ کے
چوٹی کی طرح گوندھ رہا تھا۔ جوں ہی وہ سر سبز پتیوں کی آخری نوک گوندھ
کر چھوڑتا تینوں پودے ذرا کسمسا کر علیحدہ علیحدہ ہو جاتے۔ اور وہ فوراً نئے
سرے سے مشاطگی شروع کر دیتا۔ ایک مرتبہ اس نے اپنے ہاتھ سے سعیدہ
کے بالوں میں کنگھی کی تھی اور پھر خود ہی انہیں گوندھ کر ان میں گوٹے کے گول

گول چکروں والا موباف ڈالا تھا۔ جو سر کی ذرا سی جنبش سے جھم جھم چمکتا تھا
لیکن آج گھاس کے یہ ہرے ہرے تنکے قابو میں نہیں آ رہے تھے اور کھل کھل
جاتے تھے۔ ایستھر نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا اور کہا۔

"آج سے پورے دو سال ادھر کی بات ہے کارل مجھ سے آخری
مرتبہ یہیں ملا تھا اور ہم شام گئے تک اسی جھیل کے کنارے یوں بیٹھے رہے
جیسے ہمیں بولنا نہ آتا ہو۔ میرے لئے وہ بڑی اندوہناک شام تھی۔ مجھے
لگتا تھا کہ زمین پھٹ گئی ہے اور میں اس کی دراڑ میں اترتی چلی جا رہی
میرا دم گھٹ رہا ہے، آنکھیں ابلی پڑتی ہیں، میں چیخنا چاہتی ہوں اور چیخ
نہیں سکتی دیوار کا سہارا لے کر رکنا چاہتی ہوں اور میرے پورٹے چھ
جاتے ہیں۔ ناخن اکھڑ جاتے ہیں اور دونوں ہاتھ خونا خون ہو جاتے ہیں
وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور اختر کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھاتے ہوئے
کہا۔ "اس کے بعد کارل مجھے نہیں ملا۔ اور نہ ہی اب وہ مجھے کبھی مل سکے گا
آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے اور ہری ہری گھاس کو روندتے
ہوئے وہ آگے پیچھے چل رہے تھے۔ سارے باغ پر خاموشی چھا رہی تھی
رات کی تاریکی پھیلنے لگی تھی اور درختوں کی چوٹیاں مٹیالے دھندلکوں میں تحلیل
ہوتی جا رہی تھیں۔ سنگترے کے ایک گھنے پیڑ کے پاس رک کر ایستھر نے
"اس پیڑ کے نیچے ہم آخری بار ملے۔ میں نے اسے الوداعی بوسہ
دیا اور سویٹ پیز کا ایک پھول اس کے کالر میں لگا دیا۔ کارل کی آنکھیں ڈبڈبائی
ہوئی تھیں۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر بول نہ سکتا تھا۔ وہ میرے سامنے دو

ہونا چاہتا تھا اور اس کی ٹانگیں اس کا کہا نہیں مان رہی تھیں۔ میں نے اس
کا ہاتھ دبا کر کہا میں کیا کروں کارل مجھ سے بے ایمانی نہیں ہوتی۔ جھوٹ نہیں
ہوتی۔ جھوٹ نہیں بولا جاتا اور میں تم ایسے انسان کو دھوکا نہیں دینا چاہتی۔
میں نے راتیں جاگ جاگ کر تم سے محبت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن
میں ناکام رہی میں نے تمہاری تصویر کے سامنے جھک کر کئی مرتبہ اپنی محبت
کا اعتراف کیا لیکن میرے دل نے گواہی نہ دی میں نے چلتے پھرتے اٹھتے
بیٹھتے کئی مرتبہ اپنے آپ کو سمجھایا مگر میرا دل نہیں مانا۔ میں تمہیں فریب دینا
نہیں چاہتی۔ بہروپ بھر کر تمہارے سامنے آنا نہیں چاہتی۔ مجھے تم سے محبت
نہیں ہوئی کارل میں کیا کروں۔ مجھے اپنے آپ پر اختیار نہیں۔ کارل میری باتوں
کا جواب دیئے بغیر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے چلا گیا۔ میں اس پیڑ کے
نیچے بیٹھ کر اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی حتیٰ کہ میرے آنسوؤں نے جلد
ہی اس کا وجود بھی دھندلا دیا۔ اس نے گھر جا کر پستول سے خودکشی کر لی۔ مجھے
پتہ ہے کہ اب وہ مجھے کبھی بھی نہ مل سکے گا۔ میں عمر بھر اس کی صورت نہ دیکھ
سکوں گی۔ اس کی حسرتناک موت نے میری زندگی کو کئی سال آگے دھکیل دیا
لیکن مجھے اس سے اب بھی محبت نہیں ہوئی۔ مجھے اس پر اب بھی رحم نہیں آتا۔
نہ جانے مجھے کیا ہو گیا ہے۔" ایستھر نے اختر کے کندھے پر سر رکھ دیا اور کہنے لگی۔
"بتاؤ نا مجھے کیا ہو گیا ہے۔ کس چیز نے مجھے اس درجہ سنگدل بنا دیا ہے اور
وہ کونسا ضمیر ہے جو مجھے ایسا کٹھور کر گیا ہے۔ بولو نا اختر میں کون ہوں کیا
ہوں اور مجھے کیا کرنا چاہیئے۔"

لیکن اختر اسی طرح خاموش کھڑا رہا اور اس نے ایستھر کو تھپکنا
بھی مناسب نہ سمجھا۔ ایستھر نے اسے اپنے بازوؤں میں بھینچ کر کہا۔
"تم بھی مجھے چھوڑ دو گے اور ایک دن مجھ سے منہ موڑ کر وائیلڈ
لینڈ چلے جاؤ گے۔ جہاں کے لوگ زہریلے سانپ پکڑتے ہیں۔ ہاتھی کی سواری
کرتے ہیں اور بھیانک بھیانک مورتیوں کے آگے سرنگوں رہتے ہیں۔ لیکن تم کیوں
جاؤ گے۔ کہاں جاؤ گے اور کس لئے جاؤ گے۔ ہندوستان تمہارے قابل
نہیں۔ تمہارا دیس تمہارے لئے اجنبی ہے۔ تمہارے وطن کے سپیرے
سے کوئی مناسبت نہیں رکھتے۔ تم میرے ساتھ رہو۔ میونک میں بسو اور جرمنی
کے باشندے بن جاؤ۔ ہم اکیڈمی میں رہیں گے۔ نئے نئے مقابلے لکھا
کریں گے۔ بحثیں کریں گے اور شام کے وقت ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے
اس دیس کی سڑکوں پر گھوما کریں گے۔ سارا میونک ہمیں دیکھا کرے گا اور
ہم ایک دوسرے کو دیکھا کریں گے۔"

اختر نے اس کے بالوں پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔
"مجھے منظور ہے۔ میں تمہارے ساتھ رہوں گا۔ زندگی بھر ہم
ایک دوسرے کا ساتھ نہ چھوڑیں گے اور مر کر بھی اکٹھے ہی رہیں گے۔ مجھے
جرمنی پسند ہے۔ میونک پسند ہے، تم پسند ہو۔ مجھے اپنے دیس سے ذرا
بھی محبت نہیں۔ وائیلڈ لینڈ سے رتی بھر دلچسپی نہیں۔ میں تو تمہارے ساتھ
میونک میں رہنا چاہتا ہوں۔ بولو مجھ سے شادی کرو گی؟"
ایستھر نے چونک کر اختر کو پرے دھکیل دیا۔ اور اپنا چہرہ

ہاتھوں میں چھپا کر سسکیاں لینے لگی۔

"میں تم سے شادی نہیں کروں گی اختر! تم سے شادی نہیں کرونگی۔ اگر تم میرے ساتھ رہے تو میرا کوئی ہم وطن تمہیں مجھ سے چھین لے گا۔ اور میں تمہارے ہوتے ہوئے اکیلی رہ جاؤں گی۔ اور میونک کی ساری سڑکیں ویران ہو جائیں گی۔ ایکشنے گارٹن اجڑ جائے گا۔ اور میں بھٹکی ہوئی روح کی طرح ہر بستی میں گھوم کر اسے خراب آباد بنا دوں گی —— میں تم سے شادی نہیں کروں گی۔ تمہیں واپس جانا ہوگا۔ اپنے دیس کا سفر اختیار کرنا ہوگا۔ دا ئیلڈ لینڈ میں زندگی بسر کرنی ہوگی۔ محبت بری چیز ہے۔ اور شادی تو اس سے بھی بری ہے۔ میں تم سے شادی کرنا نہیں چاہتی۔ تمہیں تکلیف میں ڈالنا نہیں چاہتی۔ تم مجھے بڑے اچھے لگتے ہو۔ بہت ہی اچھے۔ اگر تمہارا حشر بھی کارل کا سا ہوا تو میں کیا کروں گی۔ تم آج ہی لوٹ جاؤ۔ لندن کی بجائے ہندوستان چلے جاؤ۔ پھر مجھے اطمینان ہو جائے گا۔ قرار آ جائے گا اور میں تمہیں کبھی یاد نہ کروں گی۔ بولو آج ہی چلے جاؤ گے نا؟"

اختر نے ہنس کر اس کا سر اسی طرح سہلاتے ہوئے کہا۔

"پتہ نہیں بعض اوقات تمہیں کیا ہو جاتا ہے۔ عجیب سی باتیں کرنے لگتی ہو۔"

شفیع کا تار آیا کہ تم ایک ہفتے کے لئے گئے تھے لیکن آج باد

دن ہو گئے اور تمہاری واپسی کی کوئی خبر نہیں۔" اختر نے اسے ایک مفصل خط لکھ بھیجا کہ "میں ہر روز آنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن آ نہیں پاتا۔ میونک بڑا ہی دلچسپ شہر ہے۔ اور یہاں کی اکیڈیمی تو اتنی پیاری ہے کہ طالب علم امتحان پاس کرنے کے بعد بھی اسے چھوڑنا پسند نہیں کرتے اور ریسرچ کا کام شروع کر دیتے ہیں۔ میں بھی دن بھر اسی اکیڈیمی میں گھومتا رہتا ہوں۔ جرمنی زبان سیکھ رہا ہوں اور اب مجھے تھوڑی شدبد ہو گئی ہے۔ پڑھ کر مطلب سمجھ لیتا ہوں۔ اور اخبار کی سرخیاں دیکھ کر خبر کا اندازہ لگا لیتا ہوں۔ ایستھر تو مجھے ہر روز جانے کو کہتی ہے پر میں چند دن اور یہاں گذارنا چاہتا ہوں تم فکر نہ کرنا پڑھائی جاری ہے اس شدت سے تو نہیں لیکن پھر بھی امید ہے کہ پاس ہو جاؤں گا اور تم سے زیادہ نمبر حاصل کروں گا۔ اگر سعیدہ کا کوئی خط تمہارے یا میرے نام آیا تو مجھے بھیج دینا۔ اور کسی خط کی ضرورت نہیں۔ اور بنک والوں کو میرا یہاں کا پتہ دے دینا تاکہ اس ماہ کی رقم مجھے میونک پہنچ جائے۔" اس خط کے ساتھ اختر نے شفیع کو سعیدہ کے نام بھی ایک چٹھی روانہ کی تاکہ وہ لندن کے کسی ڈاک خانے سے سپرد ڈاک کر دی جائے اور کم از کم چچا کے گھر میں کسی کو اختر کے لندن سے باہر جانے کا علم نہ ہو۔

اختر کے میونک روانہ ہو جانے کے دو دن بعد سٹیلا اس سے ملنے آئی۔ شفیع نے بتایا کہ وہ چند دنوں کے لئے جرمنی گیا ہے اور عنقریب ہی لوٹ آئے گا۔ سٹیلا نے اس کے بند کمرے کو ایک نظر دیکھا اور شفیع سے

س قدر کہا کہ تم نے اسے امتحان کے دنوں میں کیوں جانے دیا۔ اور اگر ایسی کوئی ضرورت پڑ گئی تھی تو مجھے ٹیلیفون کر دیا ہوتا۔ اس کے بعد اس نے مسکرانے کی کوشش کی مگر اس سے مسکرایا نہ گیا اور وہ شفیع سے ہاتھ ملا کر اپنی ٹیکسی میں سوار ہو گئی۔

امتحان کے دن جوں جوں قریب آتے جاتے تھے شفیع کو فکر پڑتی جاتی تھی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اختر وقت پر نہ پہنچ سکے اور امتحان میں نہ شریک ہو سکے لیکن پھر وہ یہ سوچ کر چپ ہو رہتا کہ اختر ایسا بچہ تو نہیں کہ دور دراز کا سفر طے کر کے امتحان کی غرض سے یہاں آیا ہو اور یہاں پہنچ کر امتحان میں شرکت ہی نہ کرے۔ کبھی کبھار اس کو اختر کے فیل ہو جانے کا اندیشہ بھی ہوتا لیکن اسے فوراً ہی یاد آجاتا کہ وہ اپنے ساتھ کتابیں لے گیا ہے اور کتابیں کھیلنے کے لئے تو لے جائی نہیں جاتیں۔ ان ساری تسلیوں کے باوجود اس کے دل میں بعض اوقات عجیب خیالات پیدا ہونے لگتے اور ایک گمنام سے خوف سے اس کی طبیعت بوجھل سی ہو جاتی ان کی دوستی کی مدت بہت ہی قلیل تھی لیکن شفیع کو یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ ازل سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں اور اچھی طرح سے پہچانتے ہیں۔

میونک اکیڈمی کی سالانہ ضیافت پر ایستھر کی طرف سے اختر بھی مدعو تھا۔ ہال کے مرمریں فرش پر جوڑے ناچ رہے تھے۔ اور کونے میں

پچاس سازوں کا آرکسٹرا بج رہا تھا۔ دیوار کے ساتھ ایک چھوٹی سی میز کے گرد ایستھر اور اختر ارغوانی رنگ کی شراب پی رہے تھے۔ اور پیار بھری با کئے جاتے تھے ہر دو تین منٹ کے بعد کوئی طالب علم یا مہمان اختر کی نشست پر آ کر تھوڑی دیر کے لئے کھسر پھسر کرتا اور منہ لٹکائے واپس جاتا۔ ایستھر نے نیم باز آنکھوں سے اختر کی طرف دیکھا اور کہا۔

"اگر حسن اکتسابی ہے تو شاید اس کا رویہ مجھے یوں نہ کھلتا۔ لیک اگر یہ عطیۂ خداوندی ہے تو یہ ہر ایک سے ایسا برتاؤ کیوں کر رہی ہے؟"

"کون؟" اختر نے پوچھا۔

"یہ ملکۂ عالیہ جو تمہارے پیچھے تشریف فرما ہیں۔"

اختر نے پیچھے مڑ کر چور نگاہوں سے دیکھا۔ ایک بلا کی حسین لڑکی جھلا جھل گاؤن پہنے اپنے گلاس سے کھیل رہی تھی۔ اور اس کے ساتھ ادھ عمر کا ایک آدمی تھک جانے کے باعث میز پر کہنیاں ٹیکے اونگھ رہا تھا۔ ا نے اس کا جائزہ لینے کے بعد پوچھا "یہ کون ہے؟"

"کیمسٹری کی ایک طالبہ ہے۔" ایستھر نے بے پروائی سے کہا۔ "م نوجوان اسے مس میونک خیال کرتے ہیں اور سال بھر تک اس کے ساتھ ناچ کی تمنا کو کلیجے کے ساتھ لگا کر پالتے رہتے ہیں۔ تم نے دیکھا نہیں کہ ہر لڑکا کے پاس آ کر ناچنے کی درخواست کرتا ہے اور یہ رد کر دیتی ہے۔"

اختر نے مسکرا کر کہا۔ "تو انہیں اپنے حسن پر خاصا ناز ہے۔"

"کچھ ایسے ہی ہے۔" ایستھر نے ہلکی سی جماہی لے کر کہا۔ "لیکن اس

مان شاید یہاں تک نہ پہنچتا اگر ہال کے سارے لوگوں نے اس پر اپنی نگاہیں مرکوز نہ کر دی ہوتیں۔"

اختر نے ہر شخص پر ایک چھپتی ہوئی نگاہ ڈالی جو شراب کا گھونٹ بھرتے ہوئے اور سینڈوچ کا ٹکڑا کاٹتے ہوئے کنکھیوں سے دیکھ رہا تھا۔ اور جب وہ اپنی نشست سے اُٹھی تو سب کی نظریں اس کے وجود سے لپٹ گئیں اور اس کے ساتھ ساتھ سرکنے لگیں۔ وہ اختر اور ایستھر کے پاس آکر رُکی اور ذرا خمیدہ ہو کر ایستھر سے جرمنی میں باتیں کرنے لگی۔ ایستھر نے اختر سے کہا۔

"یہ تمہارے ساتھ ناچنے کی خواہش مند ہے اور درخواست لے کر آئی ہے۔ اُٹھو اور اس کے ساتھ ناچو۔"

اختر نے کہا۔ "اور اگر میرا جی نہ چاہتا ہو تو۔"

"تمہارا جی نہ بھی چاہتا ہو تو بھی تمہیں اس کے ساتھ ناچنا ہوگا۔" ایستھر نے کہا۔ "کسی خاتون کی درخواست رد کرنا انتہائی بدتمیزی ہے۔ اٹھو!"

اختر نے کہا۔ "خدا کی قسم میرا جی نہیں چاہتا۔ اور میری طبیعت ٹھیک نہیں۔ لیکن اگر یہ تمہارا حکم ہے تو سر کے بل ناچنے کو بھی تیار ہوں۔"

ایستھر نے کہا۔ "میں کیوں حکم دینے لگی۔ تمہاری اپنی مرضی ہے۔ لیکن اگر اس کے ساتھ نہ ناچے تو یہ انتہائی بدتہذیبی ہوگی۔"

"پرواہ نہیں"۔ اختر نے لاابالی پن سے کہا۔ "آگے میں کونسا رکھ رکھاؤ کا پابند ہوں۔ جو لوگ میری اس حرکت کو بدتہذیبی پر محمول کریں گے۔

"میں بدتمیز ہوں تو بدتمیز ہی سہی۔"

ایستھر نے اس لڑکی سے معذرت کی اور کہہ دیا کہ چونکہ میرے دوست کی طبیعت ٹھیک نہیں وہ ناچنے سے معذور ہے۔ اور تم سے معافی کا خواستگار ہے۔ وہ بادلِ ناخواستہ اپنی سیٹ پر جا کر بیٹھ گئی اور ہال کے لوگ سرگوشیاں کرنے لگے۔

اختر نے سگریٹ ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے کہا۔

"بھلا میں اس کے ساتھ کیوں ناچوں۔ یہ مس میونک ہوگی تو لوگوں کے لئے ہوگی میرے لئے تو یہ ایک عام لڑکی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی ہاں اگر میری مس میونک ذرا بھی اشارہ کرے تو میں موت کا ناچ ناچنے کو تیار ہوں۔"

ایستھر نے کہا۔ "میں کیوں تمہارے ساتھ ناچنے لگی کیا مجھے اپنے مقام کا علم نہیں جو تمہارے جیسے جنگلی کے ساتھ ناچنے کی تمنا کروں۔"

"شاباش"۔ اختر نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "خوب وفا کا صلہ دیتی ہو۔ تمہاری خاطر ہم نے اس آفتِ جان سے رقص نہیں کیا۔ اور اب تم ہی ہم سے رکھائیاں کر رہی ہو۔"

ایستھر اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور اپنا رومال آستین میں اڑستے ہوئے بولی۔ "باہر چلو اندر بیٹھے بیٹھے تو جی گھبرانے لگا ہے۔"

بڑے دروازے سے گذر کر وہ دیوار کے ساتھ ساتھ چل کر ہال کی پشت پر آ گئے جہاں پام کے بڑے بڑے پودے لکڑی کے چوکور گملوں میں دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ ایستھر نے کہا۔

"ادھر دیکھو، چوتھی قطار میں ایک گملا خالی پڑا ہے اس کا پودا سوکھ گیا تھا۔ ابھی تک اس میں نیا پودا نہیں لگایا گیا۔ وہاں بیٹھ کر سگریٹ پیتے ہیں۔ آج میرا بھی سگریٹ پینے کو جی چاہ رہا ہے۔"

اختر اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا اور پودوں کے چوڑے چوڑے ے لمبی لمبی انگلیاں بڑھائے ان کی راہ روک رہے تھے۔ چلتے چلتے الیسٹھر ے دم رک گئی۔ اور مڑ کر کہنے لگی۔

"اگر تم اس لڑکی کے ساتھ ناچتے تو میں تمہارا منہ نوچ لیتی۔۔۔۔۔"

"آخر کیوں؟" اختر نے بات کاٹ کر پوچھا۔ "اگر مجھے پہلے اس کا علم ہوتا ضرور اس کے ساتھ رقص کرتا۔"

الیسٹھر نے کہا۔ "آخر اسے پوچھنے کی جرأت ہی کیوں ہوئی۔ کیا وہ تی نہیں تھی کہ تم صرف میرے لئے یہاں آئے ہو اور میرے ہی لئے پیدا ئے ہو۔"

اختر نے ہنس کر کہا۔ "تو یہ سوال اس سے پوچھا ہوتا۔ مجھ سے کیوں ستفسار کیا جا رہا ہے؟"

"تم سے اس لئے پوچھ رہی ہوں کہ تمہاری کسی نہ کسی حرکت نے رور اسے شہ دی ہے ورنہ وہ جسارت کیوں کرتی۔ خدا کی قسم اگر تم اس ہاتھ تھام کر رقص گاہ کی طرف چل پڑتے تو میں بھرے ہال میں تم سے الجھ اتی اور سب کے سامنے تمہارا گلا دبا دیتی۔"

"میرا کیوں؟" اختر نے حیران ہو کر کہا۔ "اس کا نہیں جس نے مجھے

آمادہ کرنا چاہا۔"

"ہرگز نہیں۔" الیسٹھر نے تن کر کہا۔ "اس کا کیوں دباتی۔ اس پر مجھے کون سا مان تھا اور میری وہ کیا ہوتی ہے۔ مجھے اپنی چیزوں پر ہمیشہ اعتماد رہا ہے۔ اور جو نہی انہوں نے مجھ سے بے وفائی کی میں نے ان کو نابود کرنے میں سر دھڑ کی بازی لگا دی۔"

پھر وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اختر کو اپنے بچپن کا واقعہ سنانے لگی کہ مصالحے کی ایک گلابی رنگ کی گڑیا سے اسے کس قدر پیار تھا۔ جب وہ لمحہ بھر کے لئے بھی اپنے آپ سے جدا نہ کرتی تھی۔ رات کو اپنے ساتھ سلاتی۔ صبح کو اپنا منہ دھونے سے پیشتر اس کا منہ دھلاتی، کپڑے پہناتی اور چائے کی میز پر اپنے برابر والی کرسی پر بٹھا کر جھوٹ موٹ چائے پلاتی۔ ان دنوں اس کا چچا چند دنوں کے لئے میونک آیا اور اس کے ساتھ الیسٹھر کی ہم عمر اس کی بیٹی بھی تھی وہ گڑیا دیکھ کر مچل پڑی اور الیسٹھر سے درخواست کرنے لگی کہ وہ ایک منٹ کے لئے اس کو بھی گڑیا کندھے سے لگا کر تھپکنے کی اجازت دے مگر الیسٹھر نہ مانی۔ اس پر وہ رونے لگی اور الیسٹھر کی ماں نے گڑیا چھین کر اس لڑکی کو دے دی اور کہا اگر شام تک الیسٹھر تمہاری گڑیا کو ہاتھ بھی لگائے تو مجھے بتانا میں اس سے سمجھ لوں گی۔ الیسٹھر کو گڑیا کے چھن جانے کا افسوس نہ تھا لیکن ایسی بری طرح شکست کھانے کا بہت صدمہ تھا۔ اس نے کسی طرح آنکھ بچا کر گڑیا اٹھائی اور چپ چاپ کچن میں جا کر کیک بنانے والی بھٹی میں ڈال دی۔ یہ واقعہ سن کر اختر نے کہا۔

"پھر تو تم سے ڈرنا چاہیئے۔"
"مجھی سے نہیں"۔ السیتھر نے کہا۔ "ہر جرمن عورت سے ڈرنا چاہیئے
...دنیا کی بڑی سے بڑی چیز برداشت کر لیتی ہے لیکن محبت کے معاملے میں
...سی قسم کی دست اندازی یا رقابت کی متحمل نہیں ہوتی۔"
اختر نے ہنس کر کہا۔ "یہ خوب ہے۔ دست اندازی کوئی کرے اور
...بوب خواہ مخواہ میں مارا جائے۔ بھلا یہ کہاں کی منطق ہے۔"
"یہ ہمارے یہاں کی منطق ہے۔" السیتھر نے جواب دیا۔ "اور بڑی
...بصورت منطق ہے ـــــ تمہیں پسند نہیں؟"
اختر نے کہا۔ "پسند کیوں نہ ہوگی بھلا۔ مجھے تو تمہارے یہاں کی ہر
...یز پسند ہے۔"

اور یہ دن گذرتے رہے جیسے بوجھل بوڑھے سال نے قدم روک
...ے ہوں۔ مہینہ دبک کر سو گیا ہو اور تاریخیں آگے نہ بڑھ رہی ہوں۔ خفیفہ نے
...ط لکھ کر تاریں بھیج کر اختر کو امتحان کی تاریخ یاد دلائی۔ ایک ملاقاتی کی زبانی جو
...یونک آ رہا تھا اختر کو پیغام بھیجا کہ خدا کے لئے جلد آؤ۔ امتحان کوئی ہنسی
...کھیل نہیں کہ کانا اور لے دوڑے۔ اس کے لئے بہت کچھ کرنا ہے۔ کئی لوگوں
...سے ملنا ہے۔ انٹرویو کے لئے سفارشیں تلاش کرنی ہیں۔ لیکن اختر نے کسی چیز
...طرف توجہ نہ دی اور امتحان کو جوتوں کی دوکان سمجھ کر دل ہی دل میں اس کی

بولی دے ڈالی۔ السیتھر نے بھی اس معاملے میں کوئی دخل نہ دیا اور کبھی پرسش
نہ کی اور ڈپٹی کمشنری کا ادھ پکا پھل شاخ سے ٹوٹ کر لمبی لمبی گھاس میں گم ہو
گیا۔ اور جس دن اس کا پہلا پرچہ تھا اس دن وہ اور السیتھر گاڑی میں سوار
مورناو کی طرف اڑے چلے جا رہے تھے۔ ان کے پاس ایک چھوٹا سا اٹیچی
کیس تھا جس میں نہانے کا ادنیٰ لباس بڑی احتیاط سے تہہ کر کے رکھا ہوا
تھا۔ آج مورناو کی جھیل میں نہانے کا پروگرام تھا۔ السیتھر اختر کو تیراکی سکھلانے
لے جا رہی تھی اس کا خیال تھا کہ انسانی زندگی میں سمندری سفر ایک ناگزیر
حقیقت بن کر رہ گیا ہے۔ اور ایسے سفر میں اگر جہاز کسی چٹان سے ٹکرا جائے
یا آگ کی لپیٹ میں آ جائے تو اس شخص کی کیا حالت ہوگی جسے تیرنا نہ آتا ہو
اور اگر وہ شخص اختر ہو تو! السیتھر نہیں چاہتی تھی کہ اختر کبھی بھی دوسرے
جانداروں کی طرح موت سے ہمکنار ہو۔ وہ کم از کم اپنی زندگی میں ایسی خبر سننے
کی روادار نہ تھی کہ اختر کو کچھ ہو گیا ہے۔

سردی بہت بڑھ گئی تھی۔ اور مورناو تک پہنچتے پہنچتے یخ ہوا چلنے
لگی تھی۔ جھیل کے کنارے پہنچ کر اختر نے کہا۔
"ایسی یخ ہوا تو یوں ہی میری پسلیوں میں پیوست ہوتی جا رہی ہے
اگر میں نے کپڑے اتار دیئے تو یہ میرے جسم پر تلوار کی طرح چل جائیگی۔ ذرا اس
کی کاٹ تو دیکھو۔"

ایستھر نے کہا: "گھبراؤ نہیں۔ یہ ہوا تمہیں کچھ نہ کہے گی۔ اور جب تم پانی میں اتر جاؤ گے تو گرم ہو جاؤ گے۔"

اختر نے ہچکچاتے ہوئے اپنا اوورکوٹ اتارا اور کپکپانے لگا۔ اور قمیص اتارتے ہوئے تو اسے ایسی جھرجھری آئی کہ بتیسی نے کتنے سارے ستارے یکدم بجا دیئے۔ کاسٹیوم پہنتے ہی اس کی حالت غیر ہو گئی اور کنارے پر اکڑوں بیٹھ کر اس نے اپنا سر گھٹنوں میں دبا لیا۔ ایستھر نے پانی کی سطح پہ ہولے ہولے تھپیڑ مارتے ہوئے کہا۔

"جلدی ادھر آؤ۔ ورنہ تمہیں سردی لگ جائے گی۔"

اختر نے کانپتے ہوئے جواب دیا: "مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ میری جان نکلی جا رہی ہے اور سردی نے میرے اعضا منجمد کر دیئے ہیں۔"

ایستھر نے منہ میں پانی بھر کر ایک لمبی پچکاری اس کے جسم پر پھینکی اور کنارے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی: "اترو نہیں تو تمہاری ٹانگ پکڑ کر گھسیٹتی ہوں" اور اس کے کنارے تک پہنچنے سے پہلے اختر غڑاپ سے پانی میں کود گیا۔ یہاں پانی کم گہرا تھا۔ اور اختر کے بازو پر ٹیکے کا ابھرا ہوا نشان لہروں سے آنکھ مچولی کھیل رہا تھا۔ ایستھر اسے شناوری کی تعلیم دینے لگی۔ سنجیدہ استانی کی طرح منہ بنا کر اس نے ایک ہی سانس میں بہت سی ہدایات دے ڈالیں۔ اور اختر کا کندھا تھپک کر بولی: "اچھے بچے اب تیر کے دکھاؤ میں تمہیں سہارا دیتی ہوں۔" اس نے ایک ہاتھ اختر کے پیٹ اور دوسرا چھاتی کے نیچے رکھ کر کہا: "میرے ہاتھوں پر لیٹ جاؤ۔ اور ہاتھ پاؤں اسی طرح چلاؤ جس طرح میں نے بتایا ہے"

اختر نے پاؤں زمین سے اٹھاتے ہی بے طرح ہاتھ مارنے شروع کر دیئے۔ اونچے اونچے چھینٹے اڑتے۔ ایستھر نے بوچھاڑ سے بچنے کے لئے اپنا چہرہ ایک طرف موڑ لیا۔ چھاتی کا نچلا ہاتھ ذرا ڈھیلا ہوا اور اختر کو غوطہ آ گیا۔ اس نے جلدی سے پاؤں کے بل کھڑے ہو کر زور سے "اچھوں" کیا اور پانی کی نمک مرچ لگی خوشبو اس کے دماغ میں گھس گئی۔ آنکھیں مل کر اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ اور پھر کچھ کہے بنا سر کندھے پر جھکا کر کان سے پانی نکالنے لگا۔ جب وہ سر کو ذرا سا ہلاتا تو اس کے کان میں ایک بڑا سا دہکتا ہوا کوئلہ چھوں کر کے بجھتا۔ اس ایک غوطے اور اس کے بعد کی قواعد نے اختر کو خاصا گرم کر دیا۔ اور اس کے کندھوں کو چاٹتی ہوئی یخ ہوا ماند پڑ گئی۔ وہ تیرتا رہا۔ ایستھر اسے سہارا دیتی رہی اور ٹھنڈی ہوا ان کے گرد گھومتی اور ناچتی رہی!

جب وہ جھیل سے نکلے تو شام ہو چکی تھی۔ کسان گرد آلود ٹوپیاں اور کھلے تسموں کے بھاری بوٹ پہنے گھروں کو واپس آ رہے تھے۔ اور اسلحہ ساز فیکٹریوں کے رات کی مزدوری والے ملازم خاصہ دان ہاتھ میں جھلاتے اپنی نوکری پر جا رہے تھے۔ سڑک کے کنارے ایک چھوٹے سے ریستوران میں وہ چائے پینے بیٹھ گئے۔ اختر نے پیالی میں پھونک مارتے ہوئے کہا: "آج انگریزی کا ایک پرچہ ختم ہو چکا ہو گا۔ اور شفیع دھوبی کے حساب کی طرح بار بار نمبر جوڑ رہا ہو گا۔"

"ہاں" ایستھر نے ہولے سے کہا: "تمہاری پیالی میں میں نے دو چمچے چینی زیادہ ڈال دی ہے۔ یہ تمہارے دوران خون کو درست کرنے میں تھوڑی سی امداد کرے گی۔"

اختر نے کہا۔ "تمہارے ہوتے ہوئے چینی کی ضرورت نہیں۔ چاند کے
...روں ایسی عمیق آنکھیں سورج کی سی گرم شعاعیں چھوڑتی ہیں۔"
ایستھر نے آنکھیں گھما کر بڑے پیارے انداز میں کہا۔ "اب تمہیں شعور
...چلا ہے پہلے تو اپنے آپ سے نگاہ نہ ہٹتی تھی۔ وہ دن یاد ہے اختر جب میں
...نی راسو کے ٹوپ ڈیک پر پہلے پہل تم سے ملی تھی۔"
"یاد ہے۔" اختر نے سگریٹ جلا کر کہا۔ "کونٹی راسو اور اس ریستوران
...ے درمیان تمہیں ہی زمانہ پھیلا ہوا محسوس ہوتا ہو گا۔ میں تو اب بھی ٹوپ ڈیک
...یملٹ پی رہا ہوں اور تم میری خوشامد کر رہی ہو۔"
"خوشامد!" ایستھر ہنس پڑی اور دیر تک اس کا بدن ہچکولے
...تا رہا۔

شام کے وقت میونک جانے والی آخری گاڑی تیار تھی۔ اور جب
...ٹیشن میں داخل ہوئے تو گاڑی پلیٹ فارم سے آہستہ آہستہ سرکنے لگی۔
...وں کی طرح بھاگ کر وہ گاڑی میں سوار ہوئے اگلے اسٹیشن تک پہنچتے پہنچتے
...یاں روشن ہو گئیں اور باہر کی ساری چیزیں اندھیرے میں تحلیل ہو کر رہ گئیں
...ند لمحوں کے لئے گاڑی ایک اسٹیشن پر رکی اور پھر فراٹے بھرنے لگی جب
...سرا اسٹیشن آیا تو ایستھر نے اپنی سیٹ سے اٹھ کر باہر جھانکا۔ شیشے
...ے ایک بڑے سے فریم پر اسٹیشن کا نام لکھا تھا اور اس کے پیچھے بتی جل رہی
...ی۔ ایستھر نے اختر کا کندھا پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ "جلدی اترو ہم
...لط گاڑی پر سوار ہو گئے یہ تو مورناو سے بھی آگے جا رہی ہے۔" اختر بڑبڑا

کہا۔ اٹھ کھڑا ہوا اور جلدی سے دروازہ کھول کر پلیٹ فارم پر اتر آئے۔ بستیشن
سے ایستھر نے اپنی ماں کو فون کیا کہ ہم غلطی سے دوسری گاڑی میں سوار ہو کر
مورناو سے بھی دو اسٹیشن آگے نکل گئے۔ اب ٹیکسی کا بندوبست کیجئے تاکہ ہم
واپس آپ کے پاس پہنچ سکیں۔ اس کی ماں نے کہا کہ تم رات یہاں کسی سرائے میں
گذار دو اور صبح پہلی گاڑی سے میونک پہنچ جاؤ۔

یہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ اسٹیشن سے کافی دور ہرے بھرے
کھیتوں میں چھوٹے چھوٹے گھر آباد تھے۔ اور ان کی کھڑکیوں سے قدیم چراغوں
کی روشنی جھلملیں مار رہی تھی۔ جگنوؤں کی اس وادی میں دور سے ڈوبتے
ابھرتے گیتوں کی تانیں سنائی دے رہی تھیں۔ اور بہت سے آدمی ایک ساتھ
مل کر گا رہے تھے۔ اور گیتوں کے بول ان کے استقبال کے لئے بڑھتے آتے
تھے۔ پرانی وضع کی ایک چوبی عمارت کا دروازہ کھلا تھا۔ کمرے میں ایک ساتھ
کئی بتیاں جگمگا رہی تھیں اور دروازے کے آس پاس چار پہیوں والی کاٹھ
کی بہت سی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ جن کے گھوڑے تھوتھنیوں سے اگلی
ٹانگیں کھجا رہے تھے۔ اور ان کے سروں کی جنبش سے دہانوں کی زنجیریں بج
رہی تھیں۔ اور سر دوال کانوں سے نکل نکل جاتا تھا۔ ایک گاڑی کے پاس
ٹھٹھک کر انہوں نے اندر جھانکا۔ یہ قصبے کا شراب خانہ تھا۔ اور سنگ مرمر
کے لمبے کونٹر پر بیس پچیس اجڈ کسان کھڑے شراب پی رہے تھے۔ وہ نشے
میں دھت ہو رہے تھے اور اپنی پوری آواز میں دہقانی گیت گا رہے تھے۔
تین چار گتھم گتھا ایک دوسرے کو ریل دھکیل رہے تھے۔ اور گالیاں بکے

جانے تھے ۔بڑی بڑی مونچھوں والا ایک بھاری بھرکم کسان لکڑی کے ایک
ظر زور میز پہ آلتی پالتی مارے زور زور سے جھوم رہا تھا اور میز اس کے نیچے
وکر چوں چرک چوں کر رہا تھا۔ وہ ایک دوسرے کی ٹوپیوں میں شراب انڈیل
کر اوپر اچھالتے اور چیخیں مارنے لگتے۔ الیستھر نے قدم آگے بڑھایا تو اختر نے
س کی کلائی پکڑلی اور آہستہ سے کہا: "ادھر مت جاؤ۔ دیکھتی نہیں ہو کہ یہ لوگ
گل ہو رہے ہیں اور انہیں جاو بیجا کی تمیز نہیں رہی ہے۔ تمہیں دیکھ کر پتہ
ہیں ان پر کیا بھوت سوار ہو جائے اور جب انہوں نے مجھے تمہارے
ساتھ دیکھا تو اور بھی آفت آجائے گی!"

الیستھر نے ہنس کر کہا: "تم انہیں کیا سمجھتے ہو؟ یہ جرمن کسان ہیں۔
ے دیرین کاشتکار ہیں۔ لندن کے لفنگے نہیں"۔ اور وہ کھٹ کھٹ قدم اٹھاتی
سیڑھیاں چڑھ گئی۔ اختر نے اپنے اوورکوٹ کے کالر کھڑے کر لئے اور سہما
سہما اس کے پیچھے چلا آیا۔ ان دونوں کو دروازے میں داخل ہوتے دیکھ
کر انہوں نے شور مچانا بند کر دیا۔ میز والا جلدی سے میز چھوڑ کر فرش پہ کھڑا
ہو گیا اور اپنی ٹوپی اتار کر ہاتھ میں پکڑ لی۔ دھینگا مشتی کرنے والے تیزی سے
آگے بڑھے اور اٹیچی کیس اختر کے ہاتھ سے لے لیا۔ ہر ایک اپنا اپنا گلاس
چھوڑ کر گریبان کے بٹن بند کرنے لگا اور کلال خانے پر کلب کا سا سکوت
طاری ہو گیا۔ الیستھر نے کہا: "ہم غلطی سے ادھر آنکلے ہیں اور ہمیں یہاں رات
بسر کرنی ہے۔ کیا آپ میں سے کوئی ہمیں سرائے کا پتہ دے سکتا ہے؟"
"بیشک! بیشک!!" انہوں نے یک زبان ہو کر کہا اور ہولے

ہولے قدم اٹھاتے الیستھر کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ ویسی ہی ویران پگڈنڈی
پر خراماں خراماں یہ قافلہ جا رہا تھا۔ اور ان کسانوں کے درمیان گھری ہوئی
الیستھر بڑی بے تکلفی سے ان سے باتیں کئے جا رہی تھی۔ اختر دونوں ہاتھ جیبوں
میں ڈالے اور گردن سکیڑ کر کان کالروں میں کئے کنارے کنارے چل رہا تھا۔
اٹیچی کیس والا کسان اختر کو اس طرح خاموشی سے چلتے دیکھ کر اس کی طرف
بڑھا اور آخ ناخ زگ خسٹر کوپ کرنے لگا۔ تو الیستھر نے مسکرا کر کہا "یہ نہیں
جانتا۔"

صبح جب اختر سو کر اٹھا تو اس کی پسلیوں میں میٹھا میٹھا درد
ہو رہا تھا۔ اور سانس لیتے وقت ہلکی ہلکی ٹیسیں اٹھتی تھیں۔ الیستھر نے
سرائے کی مالکہ سے انڈے اور برانڈی پھینٹوائی اور چائے کی بجائے اس کا
ناشتہ کروایا۔ لیکن میونک تک پہنچتے پہنچتے اختر کی طبیعت کافی خراب ہو گئی۔
اور دو قدم چلنا بھی دوبھر ہو گیا۔ الیستھر نے سہارا دے کر اسے سیڑھیوں پہ
چڑھایا اور اس کے کمرے میں لے جا کر لٹا دیا۔ اس کے جوتے کھول کر دیر تک
تلوے سہلاتی رہی اور جب پاؤں کافی گرم ہو گئے تو ان کے ساتھ مفلر لپیٹ
کر ماں کو اپنی آمد سے مطلع کرنے کے لئے گھر چلی گئی۔

اختر نے ہاتھ بڑھا کر میز سے شفیع کا خط اٹھایا جو اس کی غیر موجودگی
میں آیا تھا۔ اس میں بھی وہی رونا تھا۔ کہ تم آئے کیوں نہیں۔ امتحان کو اہمیت
کیوں نہیں دی۔ اور میونک میں کیوں چھپے بیٹھے ہو۔ آخر میں شفیع نے لکھا تھا
کہ مجھے معلوم تھا تم امتحان دینے نہ آسکو گے کیونکہ تمہارا ایسا ارادہ نہیں تھا۔

لیکن میں تمہارے بغیر ہندوستان نہ جاؤں گا۔ تمہیں لینے کے لئے خواہ مجھے میونک ہی کیوں نہ آنا پڑے میں ضرور آؤں گا۔ اور اچھی طرح سے جانتا ہوں کہ مجھے ضرور آنا پڑے گا۔

شام تک اختر کا بخار شدت اختیار کر گیا۔ اور وہ نیم بیہوشی کی حالت میں الٹی سیدھی باتیں کرنے لگا۔ ایستھر کو فکر پڑ گئی اور وہ اختر کو اسی حالت میں چھوڑ کر قریبی ڈاکٹر کو بلا لائی۔ ڈاکٹر دیر تک اس کا معائنہ کرتا رہا اور جب اس نے نسخہ لکھنے کے لئے پین کھولا تو دبی زبان میں کہا "نمونیہ ہو گیا ہے" ایستھر نے پریشان ہو کر پوچھا: "خطرناک تو نہیں" ڈاکٹر نے جواب دیا "میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔ لیکن اس کے بگڑ جانے کا اندیشہ ہے۔ ابھی تک دوسرا پھیپھڑا زیادہ متاثر نہیں ہوا۔ لیکن اس کے اثر پذیر ہونے کا احتمال ضرور ہے۔" اس نے سینے پر مالش کرنے کے لئے ایک دوا تجویز کی اور ٹیکہ دے کر چلا گیا۔ اختر سو گیا تھا لیکن درد کے آثار اب بھی ظاہر تھے۔ ایستھر نے ایک نظر اسے دیکھا اور ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ اختر کا سانس رک رک کر چل رہا تھا۔ اور تنفس کے دوران میں گیلے کپڑے کے پھڑپھڑانے کی آواز پیدا ہو رہی تھی۔ ایستھر نے گیلری میں جا کر فون کیا کہ چونکہ اختر کی حالت خراب ہے اور اس کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں آج رات میں گھر نہ آ سکوں گی۔ چند لمحوں کے بعد اس کی ماں اور خالہ اختر کے یہاں پہنچ گئیں۔ ٹیکے کا اثر کم ہو گیا تھا۔ اور وہ سوتے میں کلبلانے لگا تھا۔ دونوں عورتیں دیر تک چپ چاپ بیٹھی رہیں۔ اور ایستھر گرم پانی کی بوتل بدل

بدل کر اختر کے پاؤں میں رکھتی رہی۔ آدھ گھنٹے بعد اس نے آنکھیں کھولیں۔ ا
ایستھر کی ماں اور خالہ کو دیکھا۔ انہوں نے اپنی وحشت کو دباتے ہوئے
ہی مسکراہٹ بھری نگاہوں سے اختر کو دیکھا اور خالہ نے اس کے بستر پر جھک
کر پوچھا: "اب طبیعت کیسی ہے؟"

اختر نے ہولے سے جواب دیا "سانس بڑی مشکل سے آتا ہے ا
چھاتی میں بلا کا درد ہو رہا ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔" ایستھر کی ماں نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "صبح تک
تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔ اور یہ ٹیکہ اپنا اثر کئے بغیر نہ رہے گا۔"

اختر نے کوئی جواب نہ دیا۔ تو ایستھر نے کہا: "اسے بلایئے نہیں
منع کر گیا ہے۔" تھوڑی دیر بعد دونوں عورتیں واپس چلی گئیں اور ایستھر کو
تیمارداری کے لئے چھوڑ گئیں۔ خالہ کا خیال تھا کہ اختر نہیں بچے گا۔ کیونکہ
اگر دیسی آدمی مغربی ممالک کی ٹھنڈ کھا کر بیمار ہو جائے تو وہ مشکل ہی سے
بچتا ہے۔ لیکن ایستھر کی ماں کو پوری امید تھی کہ اختر صحتیاب ہو جائے گا۔
اور بہت جلد توانائی حاصل کر لے گا۔ کیونکہ اختر کی آنکھوں میں اس نے و
روشنی دیکھی تھی جو صرف زندہ رہنے والوں کی آنکھوں میں ہوا کرتی ہے۔ ایستھ
اختر کی ٹانگیں سہلا رہی تھی۔ اور سوچ رہی تھی کہ اختر اس بیماری سے
بچ گیا تو آئندہ پچاس سال تک کوئی حادثہ اس کے قریب بھی نہ پھٹک سکے گ
لیکن مشکل تو یہ تھی کہ وہ زندہ رہتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ اختر اپنی نیم وا آنکھوں
سے کمرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ اور اس کے ذہن میں موت سے متعلق کوئی

بات بھی نہ تھی۔ ایسھتر نے اس کی کشادہ پیشانی سیاہ چمکدار بالوں اور بوجھل بوجھل پلکوں کو محبت اور ہمدردی کی نگاہوں سے دیکھا اور جھک کر اس کی ٹانگوں پر اپنا سر رکھ دیا۔ تھوڑی دیر تک وہ بے حس و حرکت پڑی رہی۔ حتیٰ کہ ہلکی ہلکی سسکیوں نے اس کو چھوٹے چھوٹے جھکولے دینے شروع کر دیئے۔ اختر نے بڑی مشکل سے لحاف کے اندر سے ہاتھ نکالا اور اس کا کندھا تھپکنے لگا۔ جب ایسھتر نے سر اٹھایا تو بالوں کے بہت سے تار اس کی ٹھوڑی اور گالوں سے چپکے ہوئے تھے اور ناک کی پھننگ پر ایک موٹا سا آنسو لرز رہا تھا۔ اختر نے اس کے کندھوں میں اپنی نحیف انگلیاں گاڑ کر اسے اپنی طرف کھینچا اور وہ اس کے کندھے سے لگ کر پھر سسکیاں بھرنے لگی۔

اگلے دن صبح تک اختر کی حالت ویسی ہی رہی اور جوں جوں دن ڈھلتا رہا طبیعت خراب ہوتی گئی۔ ایسھتر نے ڈاکٹر کا علاج ترک دیا۔ اور آئرین کو بلانے کے لئے ٹیکسی بھیج دی۔ آئرین سے اس کی ملاقات ایک ڈرامے میں ہوئی تھی جو میڈیکل کی لڑکیوں نے سٹیج کیا تھا۔ آئرین اس ڈرامے کی پروڈیوسر تھی۔ اور موسیقی کی دھنیں بھی اسی نے نکالی تھیں۔ دو سال پہلے وہ طب کی ایک بھولی سی طالبہ تھی۔ اور بات بات پر ہنس دیا کرتی تھی۔ لیکن امتحان پاس کرنے کے بعد اپنے پیشے میں آتے ہی اس نے وہ شہرت حاصل کی کہ میونک کے بڑے بڑے ڈاکٹر اس کے سامنے ماند پڑ گئے۔ دن رات کی مصروفیتوں اور مریضوں کے پریشان کن برتاؤ نے اس سے وہ ساری مسکراہٹیں تو چھین لیں۔ لیکن اس کا بھولا پن زائل نہ ہو سکا۔ سنہرے بالوں والی اکہرے بدن کی دوشیزہ

سی گڑیا جب سفید کوٹ پہنے آپریشن روم سے باہر نکلتی تو اپنے ہاتھوں اور ناخنوں کو غور سے دیکھتی اور کوٹ اتار کر نرس سے پوچھتی: "میں تھکی تھکی سی تو نہیں لگتی؟" اور پھر اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر آپ ہی آپ یہ کہہ کر آگے چل دیتی کہ نہیں مجھے ایسے نہیں لگنا چاہیئے۔ آخر میں نے کیا ہی کیا ہے۔ آئرین ایسھتر کے ان معدودے چند دوستوں میں ایک تھی جن کے پاس ایسھتر کبھی کبھار ایک آدھ گھنٹہ بیٹھنے کو موجب تسکین خیال کرتی۔ آئرین آئی۔ اس نے اختر کو اچھی طرح دیکھا۔ ڈاکٹر کا نسخہ پڑھا اور ایسھتر کو رائے دی کہ اختر کو بہت جلد ہسپتال میں داخل کرا دیا جائے تاکہ وہ ہمیشہ اس کی نگاہوں میں رہے اور تربیت یافتہ نرس اس کی تیمار داری کر سکے۔ ایسھتر کو یہ بات بہت ناگوار گذری وہ اختر کو مرتے ہوئے دیکھ سکتی تھی لیکن کسی دوسری عورت کو اس کے ساتھ ہمدردی سے پیش آتے برداشت نہ کر سکتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ایسی حالت میں اختر دم بھر کو بھی اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو اور اجنبی عورت اس کی تیمار داری کرتی رہے۔ اس نے آئرین کو وجہ بتائے بغیر صاف انکار کر دیا اور کہا کہ اگر وہ یہاں اس کی کچھ مدد کر سکتی ہے تو ٹھیک ہے ورنہ وہ کسی اور ڈاکٹر کا بندوبست کر لے گی۔ آئرین رضا مند ہو گئی اور علاج شروع ہو گیا۔ سینے پر ملنے کی دوا ترک کر دی گئی۔ اور اس کے بجائے کمر پر پلستر لگا دیا گیا۔ آئرین کے پہلے ٹیکے سے ہی اختر کی طبیعت سنبھل گئی اور وہ سکون محسوس کرنے لگا۔ دیر تک ایسھتر سے باتیں کرتا رہا اور پھر سو گیا۔ اس رات دو مرتبہ اس کی آنکھ کھلی اور صرف ایک مرتبہ اس نے شدت کا درد محسوس

گیا۔ ہدایات کے مطابق الیستھر اختر کو پابندی سے ایک چمچ برانڈی ملی دوا پلاتی رہی۔

آئرین اختر کو دیکھنے کے لئے بھی بلاناغہ تین تین چکر کاٹنے لگی۔ اور اگر اسے ہسپتال سے تھوڑی دیر کے لئے بھی فراغت ملتی تو وہ سیدھی اس کے یہاں چلی آتی۔ اس نے کئی مرتبہ الیستھر سے کہا تھا کہ اگر وہ مناسب سمجھے تو ایک نرس اس کی مدد کے لئے بھیج دی جائے لیکن الیستھر نے مناسب نہ سمجھا۔

وقت دن رات کے روپ دھارتا آگے بڑھتا رہا۔ اختر کبھی بالکل سنبھل جاتا اور کبھی اس کی حالت پہلے جیسی ہو جاتی۔ اکثر وہ تکیوں کا سہارا لے کر بیٹھ جاتا۔ اور جھلملیوں سے آنے والی دھوپ کی آڑی ترچھی لکیریں گنتا رہتا۔ اور بعض اوقات اس سے کروٹ بھی نہ لی جاتی اور اس کا سانس دیر تک اکھڑا رہتا۔ شفیع کا خط تقریباً ہر روز آتا تھا اس کے پرچے اچھے ہو رہے تھے۔ اور اسے کامیابی کی پوری امید تھی۔ انہی خطوں میں اختر کے گھر والوں کی خیریت بھی لکھی ہوتی۔ سٹیلا کا تذکرہ بھی ہوتا اور اگر اس دوران میں سعیدہ کی کوئی چٹھی آئی ہوتی تو وہ بھی ملفوف ہوتی۔ جس دن اختر کی طبیعت ذرا بحال ہوتی تو وہ شفیع کا خط ایک سرے سے دوسرے سرے تک آہستہ آہستہ پڑھتا۔ پھر اسے تہ کر کے تکیے کے نیچے رکھ دیتا اور تھوڑی دیر کے بعد اٹھا کر پھر پڑھنے لگتا۔ شفیع تقریباً ہر خط میں لکھا کرتا کہ تئیس کو امتحان ختم ہو رہا ہے اور میں ستائیس کو واپس وطن لوٹ جانا چاہتا ہوں۔ لیکن میں اکیلا نہیں جا رہا تم بھی ساتھ چل رہے ہو

میں ستائیس کے طیارے سے دو سیٹیں بک کروا لوں گا۔ اور تمہیں اطلاع کر دوں گا۔ اگر تم وقت پر نہ پہنچے تو تمہاری موت میرے ہاتھ سے واقع ہو جائے گی

آئرین کو پہلے مریض سے ہمدردی تھی پھر اس میں دلچسپی ہو گئی آخر میں تھوڑا سا لگاؤ پیدا ہو گیا۔ وہ دن میں کئی مرتبہ اس کا سینہ جانچنے آتی۔ پلستر ملاحظہ کرتی اور چارٹ بھر کر چلی جاتی۔ الیستھر کو اس کی یہ آمد و رفت کھلنے لگی تھی اور وہ ڈاکٹر بدل دینا چاہتی تھی۔ لیکن اختر رضامند نہ ہوتا تھا۔ وہ کہا کرتا "اس کے علاج سے مجھے فائدہ ہو رہا ہے۔ اگر یہ مجھے چھوڑ دے گی تو میری بیماری پھر عود کر آئے گی اور میں مر جاؤں گا۔" الیستھر کو یہ جملہ بہت ہی ناگوار گزرتا۔ اس نے کئی مرتبہ اختر سے کہا تھا۔ کہ یہ نہ کہا کرو۔ کہ اگر وہ مجھے چھوڑ دے گی تو میں مر جاؤں گا۔ مجھے تمہارے اسی بیان سے وہ زہر لگنے لگی ہے

اختر ہنس کر پوچھتا "بس ابھی سے جلنے لگی ہو!"

"بے شک" الیستھر وثوق سے کہتی اور انڈے پھینٹنے لگتی۔

کئی دنوں سے بڑی مزیدار دھوپ نکلنے لگی تھی۔ اور اختر اب روبصحت تھا۔ پلستر ابھی تک نہیں اتارا تھا۔ لیکن اب دوا کے بجائے اسے مختلف وٹامن کی خوراکیں کھلائی جا رہی تھیں اور قوت کے ٹیکے لگ رہے تھے۔ تئیس تاریخ سے دو دن پہلے اس نے شفیع کو اپنے ہاتھ سے ایک مختصر سا خط لکھا کہ الیستھر تمہیں میری بیماری کے متعلق مفصل طور پر لکھتی رہی ہے اب مجھ سے مختصر طور پر سنو کہ میں روبصحت ہوں اور بہت جلد تمہارے پاس پہنچ جانا چاہتا ہوں۔ لیکن ہم ستائیس کو روانہ نہ ہو سکیں گے۔ مجھے یہاں

چند چھوٹے چھوٹے کام کرنے ہیں اس لئے میں تئیس کی صبح کو تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا اسی دن کے طیارے میں دو نشستیں مخصوص کرا لینا اور میرا سامان باندھ کر اپنے کمرے میں رکھ لینا۔ لندن میں چند گھنٹے قیام کرنے کے بعد ہم وطن روانہ ہو جائیں گے۔ سٹیلا کو ہماری روانگی سے ہرگز مطلع نہ کرنا ورنہ بڑی مصیبت ہو گی۔ ایک خط سعیدہ کے نام بھی بھیج رہا ہوں اسے سپرد ڈاک کر دینا۔

دوپہر کو جب آئرین اختر کو ٹیکہ دینے آئی تو ایستھر نہیں تھی۔ اختر تکیے کا سہارا لئے کتاب پڑھ رہا تھا اور دریچے کی دھوپ اس کے پاؤں سے لگی بیٹھی تھی۔ اختر نے آئرین کو اندر آتے دیکھ کر مسکرا کے سلام کیا اور کتاب میز پر ڈال دی۔ کف کا بٹن کھول کر اس نے آستین اوپر چڑھائی اور آئرین کی طرف دیکھنے لگا۔ کرسی پر بیٹھنے کے بجائے آئرین نے اس کے پلنگ پر بیٹھ کر ٹیکہ دیا۔ سرنج میز پر رکھ کر وہ دیر تک اس کا بازو سہلاتی رہی۔ اس نے اختر کی نگاہوں میں جھانک کر کہا: "میرا جی تم سے اتنی ساری باتیں کرنے کو چاہتا ہے لیکن ایک تو مجھے انگریزی بہت تھوڑی آتی ہے۔ دوسرے ایستھر سے ڈر لگتا ہے ...."

"وہ کیوں؟" اختر نے پوچھا۔

"تمہاری دوست ہے نا اس لئے۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے۔" اختر نے بھولے سے کہا۔ "وہ میری آقا تو نہیں۔"

"آقا ہی تو ہے۔ تم پر ہر گھڑی حکم جو چلاتی ہے۔"

اختر ہنس پڑا اور شرارت سے آنکھیں گھما کر کہنے لگا: "تم بھی تو مجھ

پر حکم چلایا کرتی ہو کہ یہ مت کھاؤ وہ مت پیو۔ اس طرح نہ لیٹو۔ بٹن مت کھولو۔ کیا تم بھی میری آقا ہو؟"

آئرین کی آواز حلق میں پھنس گئی۔ اس نے نگاہیں دریچے پر گاڑ کر کہا: "اگر میں تمہاری کنیز بھی بن سکتی تو میں خوشی سے مر جاتی لیکن رونا تو یہ ہے کہ میں وہ بھی نہیں ہوں۔"

اختر نے اسے کندھوں سے پکڑ کر آہستہ سے کھینچا اور وہ ٹوٹی ڈال کی طرح اس کی طرف لپک گئی۔ اختر کے سینے پر سر رکھے وہ کہہ رہی تھی: "میرے ہاتھوں سے ہزاروں بیمار گزرے ہیں۔ لیکن میں نے تم سا کوئی مریض نہیں دیکھا۔ تم چارپائی پر لیٹے ہوئے بڑے ہی حسین لگتے ہو۔ کیا تم چلتے پھرتے ہوئے بھی ایسے ہی دکھائی دیتے ہو؟ مجھے تمہارے متعلق اس لڑکی نے بتایا تھا جو اکیڈیمی کی سالانہ ضیافت پر تمہارے ساتھ ناچنا چاہتی تھی۔ اور تم نے انکار کر دیا تھا۔ آخر کیوں؟ ایستھر تم پر اس قدر حاوی کیوں ہے وہ تمہیں کسی سے ملنے کیوں نہیں دیتی۔ کیا تم اس کے زرخرید غلام ہو؟ اس کی خاندانی ملک ہو؟ —— وہ تمہیں سینت سینت کر کیوں رکھتی ہے —— تم میرے مریض ہو۔ میرے ساتھ چلو۔ میرے ساتھ رہو۔ میں نے تمہاری اس قدر خدمت کی ہے اس کا کچھ عوضانہ تو مجھے دو۔ تم بیمار تھے۔ میں نے تمہارا علاج کیا۔ اب میں بیمار ہوں۔ میرا علاج تم کرو۔" وہ بولتی رہی اور اختر اسے لپٹا کر پیار کرتا رہا وہ کہہ رہی تھی: "ایستھر تمہاری پرانی دوست سہی لیکن وہ تم سے پیار نہیں کرتی مجھے تم اپنی دوست نہ سمجھو لیکن میری خدمت کا خیال تو کرو۔ تمہیں بھی ایستھر سے

پیار نہیں۔ فرض کرو اگر جہاز پر ایستھر کے بجائے میں تمہیں مل جاتی تو؟ —— وہ تمہیں پیار نہیں کرتی۔ وہ تمہیں پریشان کر کے اس پریشانی سے پیار کرتی ہے بالکل ایسی ہی میری محبت ہے میں صحت مند اختر سے محبت نہیں کرتی مجھے مریض اختر سے پیار ہے۔ بتاؤ کیا میری چاہت بھی اتنی ہی شدید نہیں؟"

دروازہ ایک دم کھلا اور ایستھر اندر داخل ہوئی اس نے پھلوں کی ٹوکری میز پر رکھ کر بڑے تحمل سے کہا: "ڈاکٹر آپ چلی جائیں اور اپنا بل بھجوا دیں۔ —— اختر کو آج سے آپ کی ضرورت نہیں"

"ہے ہے"۔ اختر نے چلا کر کہا: "میں اس ڈاکٹر کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ میں اس کے سوا کسی اور سے علاج نہیں کراؤں گا۔" آئرین اپنا بیگ اٹھا کر چپکے سے باہر نکل گئی۔ ایستھر اختر کے بستر پہ گر گئی اور اس کو سختی سے جھنجھوڑتے ہوئے بولی: "تم نے یہ کیا کیا اختر؟ مجھے مار ڈالا۔ اپنے آپ کو قتل کر دیا۔ اب کیا ہوگا؟ میں نے تمہیں کہا تھا۔ یہاں نہ آنا۔ میں تمہیں بلاؤں تو بھی یہاں نہ آنا۔ لیکن تم نہ مانے اب بھی چلے جاؤ، اس دیس سے بھاگ جاؤ گریز کی راہیں کھلی ہیں۔ فرار کے دروازے چوپٹ ہیں۔ بھاگ جاؤ اختر بھاگ جاؤ۔" اور پھر وہ پھوٹ کر رونے لگی۔ اختر چپ چاپ بت بنا اسی طرح لیٹا رہا اس نے حسبِ عادت نہ تو اس کا کندھا تھپتھپایا اور نہ ہی ایک لفظ زبان سے نکالا۔ ایستھر رو رہی تھی، چیخ رہی تھی اور اختر آنکھیں پھاڑے چھت کو دیکھ رہا تھا۔

چار دن تک آئرین نے ادھر کا رُخ نہ کیا۔ ایستھر بھی چپ رہنے

لگی۔ وہ اختر کو وقت پر دوا پلاتی۔ پھل کھلاتی اور ٹمپریچر لے کر چارٹ بھر دیتی۔ اختر نے کسی نئے ڈاکٹر کی شکل تک دیکھنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس لئے مناسب تیمارداری کا کام ایستھر ہی انجام دیتی رہی۔ ٹیکے نہ لگنے کی وجہ سے اختر پھر کمزور ہو گیا تھا اور اس کے چہرے کی سرخی آہستہ آہستہ غائب ہوتی جا رہی تھی۔ میونک کی بہاریں رخصت ہو رہی تھیں۔ دریچے کی دھوپ مدقوق ہو گئی تھی اور اختر کا کمرہ دو انسانوں کی موجودگی کے باوجود آسیب زدہ دکھائی دینے لگا تھا۔ جس میں عہد عتیق کے کسی بحری قزاق اور اس کی محبوبہ کی روحیں منڈلایا کرتی ہوں۔

تیس تاریخ کی صبح کو شفیع سارا سامان باندھ کر اپنے کمرے میں کرسی پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا اور ذرا سے دھوئیں سے اس کا کمرہ گھور گھٹا کی طرح بھر گیا تھا۔ آج سگریٹ کے دودھیا سلیٹی دھوئیں کو نہ جانے کیا ہو گیا تھا کہ منہ سے نکلتے ہی کجلا جاتا اور بندھے ہوئے سامان کے گرد منڈلانے لگتا۔

سعیدہ نے کالج سے ایک ہفتہ کی چھٹی لے لی تھی اور انتہائی مسرت سے اس کی جان نکلی جاتی تھی۔ کل ابا جی آ رہے ہیں۔ میرے منگیتر آ رہے ہیں۔ اس نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر کئی مرتبہ دہرایا اور ریڈیو کھول دیا۔ نجمہ اس کی چارپائی پر بیٹھی رسالہ پڑھ رہی تھی۔ سعیدہ نے رومال اس کے ہاتھ سے چھین کر پرے پھینک دیا اور کہا: "گولی مارو جھوٹی کہانیوں کو خیالی افسانوں کو مجھے یہ بتاؤ کہ میں کل کیا پہن کر ایروڈروم جاؤں؟"

نجمہ نے مسکرا کر کہا: "ایک تکلم، ایک تبسم۔ ایک نگاہِ بندہ نواز"